بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد نمبر ۸۳ ماہ جون ۲۰۱۵ء مطابق شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ شمارہ نمبر ۶

مدیر
خلیل الرحمان سجاد نعمانی
E-mail : ilm.zikr@yahoo.com

اس شمارہ میں

	مضامین	مضامین نگار	صفحہ نمبر
۱	نگاہ اولیں	مدیر	۵
۲	محفل قرآن	مولانا عتیق الرحمن سنبھلی	۱۱
۳	نئی نسل کے علماء وفضلاء کے نام ایک دردمندانہ پیغام	مولانا محمد عبدالقوی	۲۰
۴	مسلمانوں کا نظام تعلیم	مولانا محمد مجاہد ندوی	۳۸
۵	گھر کا سربراہ کون؟ مرد یا عورت	مولانا محمد قمر الزماں ندوی	۵۰

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ
آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ V.P. ارسال کیا جائے گا جس میں آپ کے -/35 روپے زائد خرچ ہوں گے — منیجر

ضروری اعلان

مختلف مقامات میں ماہنامہ الفرقان کی توسیع اشاعت کے لیے ادارہ نے حضرات کے نام اور فون نمبر نیچے لکھے جا رہے ہیں ان مقامات اور قرب و جوار کے حضرات ان سے رابطہ قائم کریں۔

مقام	نام	فون نمبر
۱۔ بڑودہ (گجرات)	مفتی محمد سلمان صاحب	+91-9898610513
۲۔ مالیگاؤں (مہاراشٹرا)	مفتی حسنین محفوظ صاحب	+91-9226876589
۳۔ بیلگام (کرناٹک)	مولانا تنویر صاحب	+91-9880482120
۴۔ بیڑ (مہاراشٹرا)	قاضی بک ڈپو طٰہٰ بک ڈپو	+91-9960070028 +91-9326401086
۵۔ گورکھپور (اتر پردیش)	مکتبہ ناصر	+91-9451846364
۶۔ جالنا (مہاراشٹرا)	محمد اظہر	+91-9225715159

ناظم شعبۂ رابطۂ عامہ : بلال سجاد نعمانی
E-mail: nomani_sajjadbilal@yahoo.com

☆ سالانہ زر تعاون برائے ہندوستان: (سادہ ڈاک) عمومی -/Rs.200

☆ سالانہ زر تعاون برائے ہندوستان: (بذریعہ وی پی ؎) عمومی -/Rs.230

؎ اس صورت میں پہلے سے زر تعاون بھیجنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ رسالہ وصول کرتے وقت ڈاکیہ کو مطلوبہ رقم ادا کرنی ہوتی ہے، مگر خیال رہے کہ وی پی نہ وصول ہونے پر ادارہ کو -/Rs.40 کا نقصان ہوتا ہے

☆ سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک (بذریعہ ہوائی جہاز) -/20 پاؤنڈ۔ -/40 ڈالر

لائف ممبر شپ: ہندوستان: سادہ ڈاک -/Rs.8000۔

بیرونی ممالک: -/600 پاؤنڈ۔ -/1200 ڈالر۔

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ : **Mr. RAZIUR RAHMAN**
90-B HANLEY ROAD. LONDON N4 3DW U.K
Fax & Phone:020 72721352. Email:furqanpublications@googlemail.com

❁ ادارہ کا مضمون نگار کی فکر سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔ ❁

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ الفرقان
۳۱/۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ۔
پن-۲۲۶۰۱۸ - یوپی، انڈیا۔ فون نمبر: Ph:0522-4079758

Monthly ALFURQAN
114/31, NAZIRABAD LUCKNOW
Pin-226018- U.P INDIA

e-mail : monthlyalfurqanlko@gmail.com

دفتر کے اوقات صبح ۱۰ بجے سے ۱ بجکر ۳۰ منٹ — بعد ظہر: ۲ بجے سے ۵ بجکر ۳۰ منٹ تک

اتوار کو آفس بند رہتا ہے۔۔۔۔۔

خلیل الرحمن سجاد کے لیے پرنٹر پبلیشر محمد حسان نعمانی نے کاکوری آفسیٹ پریس کچہری روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱/۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نگاہ اولیں

مدیر

مسلمانان ہند کے جن مسائل کا عام طور پر چرچا ہوتا ہے وہ وہ مسائل ہیں جن کا تعلق معاشی پسماندگی، سیاسی بے وزنی۔ سرکاری و پرائیوٹ ملازمتوں سے محرومی، قانون ساز اداروں میں روز بروز گھٹتی ہوئی شرح نمائندگی، فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ ان کی جان، مال اور عزت وآبرو پر پے در پے جارحانہ حملے، اور اب تعلیم یافتہ اور دیندار نوجوانوں کو گرفتا کر کے جھوٹے اور بے بنیاد الزامات لگا کر ان کو برسہا برس جیل میں رکھنا اور ان کی اور ان کے خاندان کی زندگی کو تباہ کر دینا اور اسی طرح کے دوسرے احوال سے ہے۔ اگر چہ ان مسائل کے لئے بھی جس طرح کی مسلسل، منصوبہ بند، منظم اور مؤثر جدوجہد ہونی چاہئے، دکھ کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ وہ نہیں ہو پا رہی ہے۔ (اور اسباب کی تہہ میں جانے کے بعد یہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اصل سبب ہمارے اندر مقصد کے لئے خلوص اور اتحاد واجتماعیت کی کمی یا فقدان ہے)

تاہم کسی نہ کسی درجے میں ان مسائل کا تذکرہ تو زبانوں پر آتا ہی رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً مختلف جہتوں سے آوازیں اٹھتی رہتی ہیں یہی مسائل ہیں جن کا تذکرہ سچر کمیٹی اور اس جیسی دوسری کمیٹیوں کی رپورٹوں اور تجویزوں میں ہوتا ہے۔ عام طور پر ہماری جمعیتوں اور تنظیموں کے جلسوں کی تقریروں، قرار دادوں اور مطالبوں میں ان ہی مسائل کا تذکرہ غالب ہوتا ہے۔

ہمارے مسائل کی ایک اور قسم وہ ہے جن کا تعلق براہ راست ہمارے ملی واسلامی تشخص اور ہماری تہذیبی انفرادیت سے ہے بلا شبہ ان مسائل کی اہمیت دوسرے تمام مسائل سے زیادہ ہے۔ اس حقیقت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آزادی کے بعد سے نہایت منظم طور پر ایک طبقے کی طرف سے، جن کے ہاتھ میں انگریزوں کے جانے کے بعد پورے ملک کا نظم ونسق ہے، یہ کوشش کی جارہی ہے کہ جلد سے جلد مسلمانان ہند کو مادی اعتبار سے ملکی آبادی کا پامال اور سب سے زیادہ پسماندہ حصہ بنا دینے کے ساتھ ساتھ ان سے ان کی

اسلامیت بھی چھین لی جائے اور انہیں بھی اسی برہمنی رنگ میں رنگ لیا جائے جس میں وہ ہزاروں سال سے جبر واستبداد کے ذریعہ ملک کی اصلی مقامی آبادی کی اکثریت کو رنگ لینے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھئے گا کہ بھارت کے باشندوں کی غالب اکثریت بدھسٹ تھی، اور مہاتما گوتم بدھ دراصل برہمنیت (جن کا دوسرا نام ہندوتوا یا ہندو مذہب رکھ دیا گیا ہے) کے سب سے زیادہ شدید مخالف تھے، اور بلاخوف وتردید کہا جاسکتا ہے کہ اس خطۂ زمیں میں برہمنیت کے خلاف سب سے زیادہ سخت آواز گوتم بدھا ہی نے بلند کی تھی، اور برہمینت کے ہاتھوں ستائے ہوئے مقامی اصلی بھارت کے باشندے ہی تھے جنہوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا تھا، اور ان کو اپنا رہبر تسلیم کر کے ایک پناہ گاہ تلاش کی تھی۔

(یہ بات تو یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر آ گئی، خدا کرے کہ اس موضوع پر آئندہ کبھی تفصیل سے کچھ عرض کرنے کا موقع ملے۔ بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مہاتما گوتم بدھا کی شخصیت اور ان کی تحریک کو ہمارے کچھ نوجوان طلبہ ریسرچ کا موضوع بنائیں۔۔۔۔۔)

تذکرہ تو چل رہا تھا اس بات کا کہ ہمارے ملک میں آزادی کے بعد سے اس کی مسلسل اور منظم کوشش ایک مخصوص طبقے کی طرف سے کی جارہی ہے کہ مسلمانان ہند کو مادی اعتبار سے ملکی آبادی کا سب سے زیادہ پسماندہ حصہ بنا دینے کے ساتھ ساتھ اس کی ''اسلامیت'' بھی اس سے چھین لی جائے (بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مادی طور پر کمزور و پسماندہ بنانے کے پیچھے بھی دراصل مسلمانوں کو اپنی اسلامیت سے دستبردار ہوکر برہمنی کلچر میں ضم ہوجانے پر مجبور کرنا ہی ہے) چنانچہ شروع ہی سے تعلیمی نصاب کے ذریعہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو برہمنی عقاید ورسوم کے پڑھنے اور اپنانے پر مجبور کرنے کی جو کوششیں جاری ہیں وہ اسی منظم کوشش کا ایک اہم اور بنیادی حصہ ہیں۔ اسی طرح آزادی کے وقت مسلمانوں کو زندگی کے ایک محدود حصہ میں شریعت کے قانون پر عمل کی جو اجازت دستور کے ذریعہ دی گئی جسے عام طور پر مسلم پرسنل لا کے نام سے جانا جاتا ہے، اسے بھی قانوناً اور عملاً چھین لینے کی جو کوشش شروع سے ہی کی جاتی رہی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلم معاشرے کی بنیادی اینٹ یعنی خاندان کو اس کی تہذیبی انفرادیت اور قانونی تحفظات سے محروم کر دیا جائے نیز اس بات کی کوشش کہ ان کے اوقاف کا، جو ان کے آزاد دینی اور ثقافتی اداروں کے لئے مالی وسائل فراہم کرتے ہیں، آئندہ ایسا بندوبست کیا جائے کہ ایسے اداروں کو امداد ملنا کم ہو اور جو مدد ملے بھی وہ ایسی شرائط و پابندیوں کے ساتھ ملے جو ان کے تہذیبی کردار کو بدل سکے اور ان کی آمدنی سے آزاد اسلامی عناصر کو سہارا ملنے کے بجائے ایسے ایجنٹوں کو سہارا ملے جو مسلم معاشرے کو اندر سے تبدیل کرنے کا

انجام دیں ۔اسی طرح اردو زبان کو جس طرح مٹایا گیا ،اس کا، اور مذکورہ بالا ان جیسے تمام اقدامات اور کوششوں کا، اصل ہدف مسلمانان ہند کی جان، مال اور عزت وآبرو سے آگے بڑھ کر ان کو اور ان کی نسلوں کو ان کے دین ان کے ایمان اور اسلام سے محروم کر دینا ہے۔

مسلمانان ہند کے ملی تشخص اور تہذیبی انفرادیت اور سادہ لفظوں میں اسلام سے ان کی اور ان کی نسلوں کی وابستگی کو جو خطرے اور جو چیلنج لاحق ہوئے ،ان کی سنگینی کو محسوس کرنے میں اگر ہمارے علماء کرام اور ان سے عملی طور پر دین وشریعت کی پابندی کا درس لینے والے دانشور حضرات، ملت کے دوسرے طبقوں کے افراد سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ۔۔۔کسی بھی ملک کے مسلمانوں کے دینی وایمانی تحفظ، اور ان کی نسلوں میں اسلامی عقائد وتہذیب کے بقاء وتسلسل پر وہاں کے علماء کی ہی نظر زیادہ پڑتی ہے کہ یہی ان کی اولین ذمہ داری اور ان کا سب سے اہم فرض منصبی ہے۔ چنانچہ شروع ہی سے وہ ہمارے عظیم علماء ہی تھے جنہوں نے ان خطرات کو شدت سے محسوس کیا، اور ان کے مقابلے کے لئے اور مسلمانان ہند اور ان کی نئی نسلوں کے ایمان واسلام کی حفاظت کے لئے حتی المقدور بھرپور جدوجہد کی ۔علماء اور ان کے رفقاء ومعاونین کے ذریعہ اس خطۂ زمین میں برطانوی استعمار کے دوران اور آزادی کے نام پر برہمنی نظام کے غلبہ وتسلط کے بعد باشندگان ملک اور ان کی نسلوں کے دین وایمان کے تحفظ کے لئے جو کوششیں انجام پائی ہیں، اور جو بحمداللہ پورے تسلسل کے ساتھ جاری ہیں، ان کی تاریخ کا بیان اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں کہ ؎

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

البتہ اتنا ضرور عرض کرنے کا دل چاہتا ہے کہ یہ تاریخ نہایت حوصلہ افزا اور ایمان افروز ہے۔اس تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ''بظاہر'' ایک کمزور اور بے سہارا اقلیت حکومت واقتدار اور اسباب ووسائل کی طاقتوں سے لیس ایک زبردست اکثریت کی سازشوں کا مقابلہ کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہی ہے۔

مسلمانان ہند کی تہذیبی انفرادیت اور ان کے ملی تشخص کے تحفظ وبقاء کے سلسلے میں میں علماء کرام کی قیادت میں کی جانے والی جدوجہد کی تاریخ کا ایک سنگ میل، یا اک اہم موڑ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام ہے۔۔۔مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے پس منظر میں ملک میں جو حالات تھے اور مسلمانان ہند کے

اسلامی وجود اور ان کی تہذیبی انفرادیت پر جو حملے، ایک نئے جوش وخروش کے ساتھ بیسویں صدی کی ساتویں دھائی کے شروع میں ہوئے تھے ان سے جو شخص بھی واقف ہے وہ بلاخوفِ تردید یہ بات کہہ سکتا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام چند قوانین کے تحفظ اور صرف عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کے لئے نہیں ہوا تھا، در اصل اس کے پیچھے مسلمانانِ ہند کے ملی تشخص اور تہذیبی انفرادیت کے تحفظ کا مسئلہ تھا—— بورڈ کے قیام کے اصل محرک چند اکابر اہل علم تھے، ان کی باہمی گفتگوؤں، مشوروں ان کی تقریروں اور تحریروں میں یہ بات صاف جھلکتی تھی کہ یہ حقیقت ان پر پوری طرح واضح تھی کہ مسلم پرسنل لا کے رائج الوقت چند ضابطوں میں نظر ثانی اور اصلاح کی بات جو بعض حلقوں کی طرف سے بڑے زور وشور سے اٹھائی جارہی ہے اس کا اصل مقصد اس سے بہت آگے جا کر مسلمانانِ ہند کو ان کے ملی تشخص اور تہذیبی انفرادیت سے محروم کرنا ہے۔ ۱۴ / ۱۵ / مارچ ۱۹۷۲ء اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند میں جو (غالباً) پہلا محدود مشاورتی اجتماع حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی دعوت پر منعقد ہوا تھا اس اجتماع سے جو بیان جاری ہوا تھا اس یہ حصہ یہاں قابل توجہ ہے۔

> ''مسلم پرسنل لا کے تحت جو مطالبات آتے ہیں اور جن کے بارے میں اصولی طور پر قانونِ شریعت نافذ ہے، اس اجتماع کے خیال میں یہ وہ خالصۃً مذہبی معاملات ہیں، جن پر امت کی امتیازی حیثیت اور ملی وتہذیبی انفرادیت کی بقا موقوف ہے، لہذا قانونِ شریعت (مسلم پرسنل لا) کے بجائے مشترک سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش یا بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی کوشش نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو ختم کرنا ہوگا بلکہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت ہوگی اور آئین ہند میں دی ہوئی مذہب وتہذیب کی آزادی پر حملہ ہوگا۔ یہ اجتماع اس روش کی مذمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور کسی قیمت پر اسے گوارہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔''[۲]

دیکھا آپ نے، مسلم پرسنل لا کا تحفظ ہمارے صاحب نظر علماء کے نزدیک ضروری ہی اس لئے ہوا کہ ان پر ''امت کی امتیازی حیثیت اور ملی وتہذیبی انفرادیت کی بقا موقوف ہے''، اور ''مسلم پرسنل لا کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی کوشش نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو ختم کرنا ہوگا۔۔۔''

۲؎ بیان کا پورا متن مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے قلم سے لکھے گئے الفرقان اپریل ۱۹۷۲ء کے اداریہ میں نقل کیا گیا تھا، یہ اقتباس وہیں سے لیا گیا ہے۔

راقم الحروف اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ ہمارے ہی کچھ لوگ جو معاشرے کے بدلے ہوئے حالات کے حوالے سے شریعت کے بعض احکام پر نظر ثانی کی ضرورت کی بات دہرانے لگتے ہیں (اور ایسے سب لوگوں کی نیتوں پر شک کرنے کی ہمت کم از کم یہ راقم نہیں کر پاتا) وہ اکثر اس پس منظر، اور اس اصل محرک کو نظر انداز کرنے کی غلطی کرتے ہیں جن میں اور جس کے زیر اثر حکومتی حلقوں یا بعض ماہرین قانون کی طرف سے اس طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں۔ ۱۹۷۲ء ہی کے ان حالات کو اگر آپ آج بھی سامنے رکھیں جن میں علماء نے مسئلہ کی اصل نوعیت کو سمجھ کر ایک مضبوط موقف اختیار کیا اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کر کے ہند میں سرمایہ ملت کی نگہبانی وحفاظت کے کام کو ایک اجتماعی اور منظم شکل دی، تو آپ کو مسئلہ کی اصل نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی، اور آپ علماء کے تجزیہ اور ردعمل کو بہتر طریقے پر سمجھ سکیں گے۔ ۱۹۷۱ء میں مسز اندرا گاندھی الیکشن میں بڑی طاقت کے ساتھ جیت کر آئی تھیں اور اسی سال دسمبر میں پاکستان پر فوجی فتح نے ان کی شخصیت کے سورج کو وہ تابانی بخش دی کہ وہ ''درگا دیوی'' بن گئیں۔ اور ایک ایسا نشۂ قوت ان کے اعصاب پر چھایا کہ خدا کی پناہ! وہی دن تھے جب انہوں نے مسلمانان ہند کے اسلامی تشخص پر بھی وار پر وار کرنے شروع کئے۔ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ بھی ان ہی دنوں زور وشور سے اٹھایا گیا۔ اور غرض مند ہر طرف سے ہاں میں ہاں ملانے کے لئے امنڈ پڑے۔ ان کا دوسرا بڑا وار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر تھا اپنی طاقت کے بل پر انہوں نے ایک ایسا ایکٹ اس کے سلسلہ میں بنا دیا جس سے یونیورسٹی کی مخصوص انفرادیت کو نیست ونابود کرنا مقصود تھا۔ پھر جب مسلمانوں نے ایک دن (۱۶ / جون ۱۹۷۲ء) اپنی بے حسی اور ناگواری کا اظہار کرنے لئے چُنا تو (یوپی) میں پولیس اور پی، اے، سی نے وہ مار ان کو لگائی کہ بعض نہایت محتاط اور ثقہ حضرات کے بقول ایسی مار اس سے پہلے صرف اس قسم کے احتجاج پر آزاد ہندوستان میں کبھی نہیں لگی تھی۔

الغرض یہ تھے وہ حالات جن میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا تھا، اور جیسا کہ سطور بالا میں ایک سے زیادہ بار عرض کیا گیا اس کا اصل مقصد مسلمانان ہند کی تہذیبی انفرادیت اور ملی تشخص کا تحفظ تھا۔۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ اس دور کے بورڈ کے قائدین نے جرأت وہمت، عزم وحوصلے اور حکمت ودانشمندی کے ساتھ بورڈ کے پلیٹ فارم سے حکومت اور مسلم عوام دونوں کو آواز دی، اس کا گہرا اثر دونوں سطح پر پڑا بلکہ ملک کے دوسرے طبقوں کو بھی اس سے حوصلہ ملا اور صرف ایک سال کے عرصہ میں ''درگا دیوی'' کی جگہ ''کالی

مائی'' کا روپ لوگوں کو نظر آنے لگا۔

آج ہند میں اسلام اور مسلمان اپنی تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ہیں اس کے بارے میں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں، مسلمانان ہند کو اپنے مذہبی تشخص اور تہذیبی انفرادیت سے محروم کرنے اور انہیں بھی برہمنی تہذیب میں ضم کر لینے کی جو کوششیں جو پہلے کچھ احتیاطوں اور ہچکچاہٹ کے ساتھ ہوتی تھیں وہ اب کھلم کھلا اور ڈنکے کی چوٹ پر ہو رہی ہیں۔ پس اس چیلنج کے مقابلے کے لئے بلا شبہ ایک مضبوط اور حکیمانہ موقف اور طریق کار درکار ہے جس میں ہمت اور حکمت کا بھرپور امتزاج ہو۔

یہاں یہ بات مزید صراحت اور وضاحت کے ساتھ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کو عام مسلمانوں کی نگاہ میں جو وقار و اعتبار حاصل ہوا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہر مسئلہ کے حل کے لئے مسلمانان ہند کی نگاہیں بورڈ ہی کی طرف اٹھتی ہیں، اور لوگ اسی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہر مسئلہ کے لئے بورڈ حرکت میں آئے گا، اور آواز بلند کرے گا۔ اور یہ جز بورڈ کے ان ذمہ داران کے لئے پریشانی کا باعث بنتی ہے، جو بخوبی جانتے ہیں کہ بورڈ کا دائرۂ کار محدود ہے۔

دوسری طرف یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ مسلمانان ہند کی مذہبی و تہذیبی انفرادیت اور ان کے ملی تشخص کا تحفظ بورڈ کے قیام کا اصل مقصد ہے۔ اور اگر کوئی اس بنیادی کام کو بھی بورڈ کے دائرۂ کار سے باہر کی چیز سمجھتا ہے تو اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ بورڈ ملک کے مسلمانوں کو بھی اپنے ملی تشخص کی حفاظت کے لئے ضروری اور مناسب تدبیریں اختیار کرنے کی واشگاف دعوت دے اور اس کی بھی ہر ممکن کوشش کرے کہ مسلمانوں سے ان کی اسلامیت چھیننے کا ارادہ رکھنے والوں کا ارادہ بدل دے اور جب تک اور جس حد تک یہ ارادہ کارفرما رہے اسے ناکام بنایا جائے۔ اور اس کوشش میں ملک کی اکثریتی آبادی کے زیادہ سے زیادہ طبقات کو اپنے ساتھ لیا جائے۔ کاش کہ بورڈ کے ذمہ داران ان معروضات پر توجہ دیں۔ اللھم ألھمنا مراشدامورنا وأعذنا من شرور انفسنا و من سیئات أعمالنا۔

☆☆☆

محفل (۱۴۵) سورۃ الأنعام (۴)

حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

قریش کی بے حسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رنج والم اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے ارشادات

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰۗىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ۭ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ۭ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ۭ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَاۗءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

ترجمہ

ہمیں پتہ ہے کہ یہ کافر جو باتیں کیا کرتے ہیں وہ تمھیں رنجیدہ کرتی ہیں، مگر یہ تمھیں نہیں جھٹلاتے، بلکہ یہ ظالم تو آیاتِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں (۳۳) اور (یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلے رسول بھی (اسی طرح) جھٹلائے گئے تھے، سو انھوں نے اپنے جھٹلائے جانے اور ستائے جانے پر صبر کیا حتّٰی کہ ہماری مدد اُن کو آپہنچی (۳۴) اور (یاد رکھو) اللہ کے لکھے کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور تمھارے پاس رسولوں کی کچھ سرگزشتیں آئی ہوئی ہیں۔ اور (پھر بھی) اگر ان لوگوں کی روگردانی تم پر بھاری ہے، تو زمین میں کوئی سرنگ اگر ڈھونڈ سکتے ہو یا آسمان میں کوئی سیڑھی، تو جاؤ اور خود کوئی نشانی لے آؤ۔ (بات یہ ہے کہ) اللہ اگر چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ سو تم نادانوں میں سے نہ ہو (۳۵) (اور دیکھو) دعوت کو وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہوں۔ رہے مُردے (وہ کہ جو سننے سے انکاری ہیں) اللہ ان کو (قبروں سے) اُٹھائے گا پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے (۳۶)

اور کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی اُس کے رب کی طرف سے کیوں نہیں اُتری۔ کہو کہ اللہ قادر ہے کہ نشانی اُتارے، پر اکثر لوگ جانتے نہیں (۳۷) اور زمین پر چلنے والا کوئی جانور ہو یا (فضا میں) اپنے بازوؤں سے اُڑنے والا پرندہ سب تمھاری ہی طرح کی اُمتیں ہیں۔ کوئی شئ بھی ہم نے اپنے رجسٹر میں لکھنے سے نہیں چھوڑی ہوئی ہے۔ بالآخر پھر سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جائیں گے (۳۸) اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں (طرح طرح کی) تاریکیوں میں پڑے۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر ڈال دیتا ہے (۳۹)

کہو (اے نبی) کہ ذرا غور کرو کوئی عذاب تم پر آپڑے یا قیامت کا ہول آپہنچے تو کیا غیر اللہ کی دہائی تم دو گے؟ اگر تم سچے (اپنے عقیدے میں) ہو (۴۰) نہیں بلکہ اُسی کو پکارو گے، پھر وہ اگر چاہے گا تمھاری مصیبت کو دور کر دے گا۔ اور وہ کہ جنھیں تم پکارا کرتے ہو اُنھیں (اس وقت) بھول جاؤ گے (۴۱) اور ہم نے تم سے پہلے گزری امتوں کی طرف رسول بھیجے پھر (ان کی نافرمانی پر) تنگی اور تکلیف سے اُن کی پکڑ کی، کہ شاید یہ ڈھیلے پڑ جائیں (۴۲) پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب ہمارا عذاب ان پر آیا تھا تو وہ گڑگڑاتے، (بلکہ اُلٹے) ان کے دل سخت ہو گئے اور وہی اعمال جو وہ کیا کرتے تھے انھی کو شیطان نے ان کی نظر میں خوشنما کر دیا۔ (۴۳) سو جب

انھوں نے وہ بات بُھلادی جس کی نصیحت ان کو کی گئی تھی، تو ہم نے ان پر ہر شئ کے دروازے کھول دئے ، یہاں تک کہ وہ ان نعمتوں پر خوشی میں مگن ہوگئے تو ہم نے انھیں یکا یک آ پکڑا ،اور وہ بس دیکھتے رہ گئے (۴۴) سو اس طرح جڑ ان لوگوں کی کاٹ دی گئی جو ظلم کرتے تھے۔ اور اللہ ہی کے لئے ہیں تمام تعریفیں جو پروردگار سب جہانوں کا ہے (۴۵)

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دردمند دل اور قریش کی بے حسی

سورت کے بالکل شروع میں بعض آیتیں، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، شہادت دیتی گزری ہیں کہ یہ مکی دور کے بالکل آخری دنوں کی سورت ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ میں ایمان کی منادی کرتے ہوئے دس برس سے بھی اوپر ہو چکے تھے، تب بھی حال وہ تھا جو یہاں تک کی آیتوں سے ظاہر ہوتا آرہا ہے۔ یعنی اہلِ مکہ، بالخصوص سردارانِ قریش، کو نہ صرف بات سمجھنے کی توفیق نہیں ہو رہی تھی بلکہ دعوتِ ایمان کی راہ روکنے میں وہ شیطان کے اعوان و انصار بنے ہوئے تھے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دن رات کی جد و جہد محض ان لوگوں کی بھلائی کے لئے تھی۔ خود قرآن کے مطابق آپؐ کے خلوص کی کیفیت اس راہ میں یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو آپ پر ''رحم'' آتا تھا۔ جس کا اظہار بار بار اس طرح کی آیات سے ہوا ہے جیسے فرمایا گیا: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ (سو ان پر افسوس میں کہیں تمھاری جان ہی نہ جاتی رہے''۔ (سورہ فاطر۔۸) اس خلوص اور دردمندی کا صلہ جب دن بدن بڑھتی ہوئی مخالفت سے ملے اور طرح طرح کے نام، ساحر، شاعر، کاہن، مجنون، (جن کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ملتا ہے) آپ کے لئے تراش کر، کوشش کی جائے کہ کوئی شخص بھی آپ کی بات کو سنجیدگی سے نہ لے، تو پھر کیا کچھ نہ آپ کے دردمند دل پہ گزرتی ہوگی؟ کچھ ایسی ہی غیر معمولی صورتِ حال بظاہر ہے جس میں بندہ سوئے آسماں دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پس آپ کی تسلی کے لئے کئی باتیں یکے بعد دیگرے ارشاد فرمائی گئی ہیں:

(۱) قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ ۔۔۔ الاٰیۃ۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ تم پر ان لوگوں کے رویہ سے کیا گزر رہی ہے۔ مگر یہ لوگ تمھیں تھوڑے ہی جھٹلاتے ہے یہ تو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ (فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ ۔۔۔) اور یہ واقعہ بھی تھا کہ وہ لوگ قرآن کے مضامین کو جھٹلاتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ذاتی طور پر اب بھی صادق و امین جانتے تھے۔ خود ابوجہل جیسے دشمن دین سے بدرؔ کے میدان کا یہ قول مروی ہے کہ ''ہم محمد کو جھوٹا نہیں جانتے لیکن نبی اس کو نہیں مان سکتے۔'' بحیثیت نبی آپ کی دعوت سے

ان لوگوں کے پشتینی عقائد، مزعومہ مفادات اور سرداری کے خنّاس پر ضرب پڑتی تھی اس لئے اس معاملہ میں وہ بدترین دشمنی میں بھی مضائقہ نہ جانتے تھے۔

(۲) دوسری بات اسی تسلّی کے مقصد سے فرمائی: (وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۔۔۔۔) یہ کوئی نئ بات تمھارے ساتھ نہیں ہو رہی ہے، رسولوں کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے اور ان کا طریقہ اس پر صبر اور برداشت کا رہا، حتّٰی کہ ان کو ہماری مدد آ پہنچتی''۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسولوں کے صبر و برداشت کا کوئی پیمانہ اللہ کے یہاں مقرر ہے، جس کے بعد مدد کا قانون حرکت میں آتا ہے۔ اس پیمانہ کا اندازہ بعض دوسری جگہ کی آیات سے ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں آیت ۲۱۴، اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مخاطب کر کے کہتی ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۔۔۔۔ الآیۃ (کیا تم نے سمجھا ہے کہ جنت میں یونہی داخلہ پالو گے جبکہ ابھی وہ حالات تم پر نہیں آئے ہیں جن سے تم سے پہلے والے لوگ گزرے تھے ۔۔۔۔ یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھی پکار اُٹھتے کہ ''مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ '' (کب وقت آئے گا کہ اللہ کی مدد آجائے؟) اور پہلے اہلِ ایمان پر جو جو گزری اس میں یہاں تک آتا ہے کہ سروں پہ آرے چلائے گئے۔ پس معلوم ہوا کہ صبر و برداشت کا پیمانہ انتہائی سخت ہے۔ اور غور کیا جائے تو یہ سراسر حکمت کے ماتحت ہے۔ اور وہ ہے اصحابِ انبیاء علیھم السلام کو نمونہ کی ہستیاں بنانا، جو بغیر آزمائشوں کے ممکن نہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محفلِ قرآن جلد اول (قرآن کے دو باب) محفل ۴۹۔

(۳) تیسری بات اللہ کی طرف سے مدد کے قانون کے اٹل ہونے کے حوالہ سے فرمائی گئی کہ : ''وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ '' (اللہ کی باتیں، اس کے فیصلے کوئی نہیں بدل سکتا)۔ اس لئے نبی کو پورے بھروسہ کے ساتھ صبر و برداشت پر قائم رہنا ہے۔ اور وہ کلمہ اور فیصلہ جو رسولوں کے حق میں پہلے سے صادر شدہ ہے، قرآنِ پاک میں بہت صاف اور اور بیحد اطمینان بخش انداز میں سنا دیا گیا ہے۔ ۳۷ویں سورہ الصافّات میں ارشاد ہوا ہے وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ (اور ہمارا یہ فیصلہ اپنے بندگانِ مُرسَل کیلئے پہلے سے صادر ہو چکا ہے کہ وہی غالب کئے جائیں گے اور ہمارا ہی لشکر ہے جسے غالب رہنا ہے۔ (الصافات)

(۴) چوتھی بات مزید اطمینان بخشی کے لئے ارشاد ہوئی: وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾ (اور تمھیں تو ہم کچھ رسولوں کی سرگذشت سے آگاہ کر چکے ہیں) جس سے پتہ چلتا ہے یہ رسول جیسے کچھ بھی

سخت حالات سے گزرے ہوں پر آخر کار ہمارا فیصلہ برابر عمل میں آتا رہا ہے۔ عاد وثمود اور قومِ لوط وغیرہ سب ظالموں کے ساتھ اللہ کا معاملہ جگہ جگہ ذکر میں آیا ہے کہ کیسے آن کی آن میں ان کی پکڑ کر کے ان کے انبیاء علیہم السلام کی مدد فرمائی گئی۔ پس تمھیں اپنا کام صبر وسکون اور بھروسہ کے ساتھ جاری رکھنا ہے۔

اللہ کے قانونِ ہدایت کی یاد دہانی

آگے ارشاد ہورہا ہے: وَاِنۡ کَانَ کَبُرَ عَلَیۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ ۔۔۔۔ اور اگر ان لوگوں کی بے اعتنائی تمہارے لئے پھر بھی ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے، اور جی چاہتا ہے کہ ایمان لانے کے لئے جو معجزاتی نشانیاں دکھانے کی شرط یہ لوگ لگاتے ہیں تو وہ دکھا کر ان کو راہِ راست پر لے آیا جائے، کہ گذشتہ قوموں کا سا دن ان کو نہ دیکھنا پڑے۔ تو پھر اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ تم خود ہی اس نشانی کی تدبیر کرلو، اس کے لئے زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان کی طرف کوئی سیڑھی، اور ان کے لئے مطلوبہ نشانی نکال لاؤ اُتار لاؤ۔ ورنہ اللہ اگر چاہتا تو بس یونہی ان کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا۔ فرمایا وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمۡ عَلَی الۡهُدٰی ۔ گویا ارشاد ہوا کہ تم ان کی ہدایت کے لئے ایسی بات کے خواہشمند ہو رہے ہو جو اللہ کی مشیئت سے مختلف ہے۔ اللہ کیا اپنے بندوں کی ہدایت نہیں چاہتا؟ لیکن یوں آپ سے آپ کسی کے گلے میں ہدایت باندھ دینا اس کی مشیئت نہیں ہے، ورنہ انبیاء ورُسل بھیجنے کے بجائے وہ ہر ایک کو یونہی راہِ ہدایت پہ ڈال دیتا۔ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡجٰهِلِیۡنَ ﴿۳۵﴾ (سوتم نادانوں میں سے نہ ہو جاؤ) یعنی تم تو اللہ کا دستور جانتے ہو پھر اس طرح کی خواہش کے کیا معنیٰ جو ہمارے دستور کے خلاف جاتی ہے؟ ایسی آیتیں بندوں کو یہ سمجھانے کے لئے کافی ہونی چاہئیں کہ رسالت کا مرتبہ اپنی جگہ، مگر رسول رہتا بندہ ہی ہے بلکہ اس کی بندگی تو اور سوا ہو جاتی ہے۔ مگر افسوس کہ لوگ رسالت کے معنیٰ سمجھتے ہیں کہ رسول بندگی سے باہر ہوتا ہے!

اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مزید سمجھانے کے طور پر ارشاد ہوا ہے: اِنَّمَا یَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ یَسۡمَعُوۡنَ ؕ ۔۔۔ الاٰیة (بات ماننے والے تو وہ ہوتے ہیں جو سن تو رہے ہوں، رہے ''مردے'' جن کے بیچ میں تم کھڑے پکار رہے ہو، ان کے لئے اس دن کا انتظار کرو جب اللہ ان کو موت کے بعد اُٹھائے گا اور یہ اس کی طرف یہ لوٹائے جائیں گے۔ یعنی یہ اس وقت سے پہلے، جبکہ قیامت میں زندہ کئے جائیں، نہیں سنیں گے، کیونکہ یہ اپنے کانوں پر مہر لگوا کر مُردوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے ملول ہونے اور کسی معجزاتی نشانی کے خواہش مند ہونے کی ضرورت نہیں۔

مطلوبہ نشانی نہ اُتارنے میں کفار ہی کی بھلائی

یہ معجزاتی نشان جس کا مطالبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت تسلیم کرنے کیلئے کفارِ مکہ کیا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالآخر خواہشمند ہوئے کہ یہ کام ہوجائے اور ان لوگوں کی تکذیب کا منہ بند ہو، اسی کے حوالہ سے آگے فرمایا جارہا ہے: وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔۔۔۔ (اور یہ کہتے ہیں کہ پیمبر پر کوئی نشانی کیوں نہیں اس کے رب کی طرف سے اُتاری گئی؟) اور اس کا جواب آپ ہی سے دلوایا جارہا ہے: قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (اللہ بیشک اس بات پر قادر ہے کہ کوئی نشانی اُتار دے۔ لیکن لوگ جانتے نہیں) کیا نہیں جانتے؟ اس نامکمل جملہ کے ایک ہی معنی بظاہر ہوسکتے ہیں۔ کہ جانتے نہیں کہ وہ کیسی خطرناک فرمائش کررہے ہیں! گویا ان کی فرمائش اسی طرح کی تھی جیسی اوپر آیت (۸) میں ایک گزری ہے۔ (''کیوں نہیں ہوا کہ کوئی فرشتہ اس کی رسالت کی شہادت دینے کے لئے اتار دیا جاتا۔'') اس فرمائش کے جواب میں ارشاد ہوا تھا کہ اگر ہم فرشتہ اتار دیں (لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا ۔۔) تو پھر جو مہلت ملی ہوئی ہے اس کا قصہ تمام ہوجائے، اور زندگی کی بساط لپٹ جائے۔ بس اس فرمائش کی تعمیل کا بھی جو یہاں ذکر کی جارہی ہے یہی نتیجہ تھا جسے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

بعث بعد الموت اور اللہ کا بے پایاں علم اور قدرت

کفار کا یہ سرکشی و بے باکی والا رویہ تمام تر نتیجہ بعث بعد الموت (زندگی بعدِ موت)) کو نہ ماننے کا تھا، جبکہ قرآن طرح طرح کی دلیلوں اور مثالوں سے دکھا رہا تھا کہ یہ تو کسی طرح بھی ایسی بات نہیں کہ خارج از امکان سمجھی جائے اور رسول کا مذاق اُڑایا جائے کہ دیکھو کیسی انہونی بات پر یقین لانے کو ہم سے کہہ رہا ہے! یہاں بظاہر ایک نئے پہلو سے ان کی ناسمجھی کا مداوا کرنے کے لئے فرمایا جارہا ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ۔۔۔ کہ تمھیں شاید یہ نہیں سمجھ میں آرہا کہ یہ جو انسانی دنیا کے اَن گِنت افراد میں سے ایک ایک کو زندہ کرنے اور پھر ان سب کے اعمال کا حساب لئے جانے کی بات کہی جارہی ہے یہ کیسے ممکن ہوگی، تو سنو کہ اللہ کی قدرت کا حال تو یہ ہے کہ زمین پر چلنے اور رینگنے والے تمام حیوانات اور فضا میں اُڑنے والے تمام کے تمام پرندے بھی دوبارہ زندہ کرکے اپنے رب کے حضور لائے جائیں گے۔ ان کے اَن گنت افراد اور ان کی زندگیوں کا بھی مکمل ریکارڈ اس کے یہاں رکھا جارہا ہے۔ اور وہ بھی اپنی زندگیوں میں تمھاری ہی مثل ہیں۔ کھانے پینے، رہنے سہنے، اجتماعیت و انفرادیت

وغیرہ ہر چیز کا ایک خاص نظام ان میں سے ہر نوع اور ہر صنف میں جاری وساری ہے۔ان کی بھی پیشی ان سب چیزوں کے مکمل ریکارڈ کے ساتھ ہوگی۔(اور حدیث کے مطابق یہ پیشی بھی ان کے آپس کے جھگڑوں میں انصاف (یعنی حساب کتاب) کے لئے ہوگی۔(روح المعانی بحوالہ صحیحین) غرض، جولوگ انسانوں کے حشر اور حساب کتاب کو غیر امکانی چیز سمجھ رہے ہیں وہ دراصل اللہ کی ہستی اور اس کے علم اور قدرت کا اس کی شانِ عالی کے مطابق اندازہ کرنے سے قاصر ہیں۔اسی کو سورۂ حج میں فرمایا گیا: مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾ (الحج)

تنبیہ

جانوروں کے حشر اور ان کے مقدمات فیصل کئے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ تفسیر ابنِ کثیر کے مطابق اس کے بعد یہ سب اللہ کے حکم سے خاک ہو جائیں گے۔'' اس کے برخلاف بعض تفسیروں میں یہ عجیب و غریب بات لکھدی گئی ہے کہ کچھ جانور ایسے بھی ہوں گے جنھیں جنت میں داخلہ ملے گا!

کفار کے کفر پر بضد رہنے کی مثال

جہاں تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی نشانیوں کا تعلق تھا ان کی کوئی کمی قرآن کے بیانات میں نہیں تھی۔یہ وہ نشانیاں تھیں جو انسان کے گردوالی کائنات کی صورت میں ہر طرف پھیلی ہوئی اللہ کی وحدانیت کی بھی شہادت دے رہی تھیں اور اس کی ان صفات کی بھی جو رسالت کا بھی تقاضہ کرتی ہیں اور آخرت کا بھی، اور قرآن انھیں بار بار نئے نئے انداز سے دہرا رہا تھا۔لیکن یہ لوگ ان سب سے اندھے بہرے بنے فرمائش کرتے تھے معجزے دکھانے کی۔جیسے سورۂ بنی اسرائیل کے حوالہ سے نہایت دلچسپ فرمائشوں کی ایک پوری قطار پیچھے گزری ہے۔ان کے اس حال کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد ہورہا ہے کہ وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۔۔۔ یہ لوگ قرآن کی تکذیب پر جو بضد ہیں سو وہ اپنے اس حال کی وجہ سے کہ ''بہرے اور گونگے'' ہونے کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی ظلمتیں بھی انھیں گھیرے ہوئے ہیں۔جس کے بعد ان سے کسی ڈھنگ کی بات کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ لہٰذا ان کی ہدایت کے لئے پریشان نہ ہو، فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو۔مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۳۹﴾۔وہ اپنے قانونِ ہدایت وضلالت کے مطابق جس کو چاہتا ہے گمراہی میں پڑا رہنے دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے اسے صراطِ مستقیم پہ ڈال دیتا ہے۔

انسان مانے نہ مانے، دل توحید کا گواہ ہے

اب فقط اللہ ہی کے حاکم و مالکِ کائنات ہونے کی ایک دلیل خود ان کے اپنے حال سے لائی جا رہی ہے۔فرمایا: قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ ۔۔۔۔پیغمبر کہو کہ ذرا یہ بتاؤ اگر اللہ کا کوئی عذاب تم پہ آ پڑے یا قیامت ہی آ جائے تو اس وقت کیا کسی غیر اللہ کو پکارو گے؟ (نہیں) بلکہ فقط اسی کو پکارو گے اور جنھیں شریک ٹھیراتے ہو انھیں بھول جاؤ گے۔ پھر وہ اگر چاہے گا تو تمھاری مصیبت دور کر دے گا۔تو کیا یہ تمھارے دل کی شہادت نہیں کہ حقیقی مالک و حاکم وہی ہے؟ مگر تم ہو کہ پھر بھی توحید کی بات سننے کو تیار نہیں'۔ یہ تو فرضی سوال تھا۔مصیبت کے وقت شریکوں کو بھول جانے اور فقط اللہ ہی یاد رہنے کی ایک واقعی مثال بھی قرآن میں آتی ہے۔سورہ عنکبوت میں آتا ہے: بحری سفر پہ جب نکلتے ہیں، جو کہ خطرہ کا سفر ہوتا ہے، تو اللہ کو خالص اسی پر اعتقاد کے ساتھ پکارتے ہیں کہ خیریت سے سفر پورا کرا دے (فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ) لیکن جب وہ خیریت کے ساتھ کنارے لگا دیتا ہے تو بس شرک کی طرف لوٹ جانے میں ذرا دیر نہیں لگاتے (فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾)

ایسے لوگوں کا انجام تاریخ کے آئینے میں

اوپر آیت ۳۴ میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا گیا تھا کہ تمھیں جو تجربہ اپنے مخاطبین سے ہو رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے، تم سے پہلے رسولوں کو یہی سب پیش آتا رہا ہے۔اور تمھاری طرح وہ بھی ملول و مضطرب ہوتے رہے ہیں۔اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے صبر و برداشت کی تلقین تھی۔اب اسی تاریخی حوالہ کا وہ پہلو سامنے لایا جا رہا ہے جس میں آپ کے مخاطب منکرین اپنا چہرہ اور اپنا انجام دیکھ سکتے ہیں۔فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ ۔۔۔۔ہم نے تم سے پہلے کی امتوں میں بھی اپنے رسول بھیجے تھے۔اور ان امتوں کے بد بختانہ رویہ پر ہم نے ان کو ذرا تنگیوں اور سختیوں کے ہاتھ سے پکڑا، کہ کچھ سمجھ آ سکتی ہو تو اچھا ہے۔مگر بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلط کاری کا احساس کرتے اور اپنے رب کے حضور گڑگڑاتے ان کے دل اُلٹے اور سخت ہو گئے۔اور شیطانی غلبہ کے اثر سے انھیں اپنے اعمال ایسے ہی اچھے لگتے رہے جیسے پہلے لگ رہے تھے۔یعنی کوئی سبق انھوں نے ہماری اس پکڑ سے نہ لیا، کوئی جاگ ان میں نہ پیدا ہوئی۔تو ہم نے عیش و عشرت کے دروازے ان پہ چوپٹ کھول دئے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان نعمتوں میں مگن ہوئے تب ہم نے ان کو اچانک آ پکڑا (اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً) اور اب وہ بس نا امیدی کی تصویر تھے (فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾)

''کوئی سبق نہ لینے'' پر بجائے زیادہ سخت پکڑ کے، عیش وعشرت کے دروازے کھول دینا باعثِ تعجب نہ ہونا چاہئے۔ اللہ کے یہاں ڈھیل دینے کا بھی قانون ہے۔ زیادہ ڈھیٹ مجرموں کو اسی طرح سزا دی جاتی ہے، تاکہ پیالہ لبالب بھر لے۔ قرآن میں کئی جگہ اس قانون کا حوالہ ہے۔ مثلاً سورۂ حج میں ارشاد ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ ۔۔۔(اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ جب وہ ظلم میں مبتلا تھیں تو میں نے ان کو ڈھیل دی اور پھر بعد میں ان کو پکڑا۔۔۔)

ایسوں کا یہ انجام مخلوق کے لئے عین رحمت

آیت کا آخری جملہ ہے فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ پس اس طرح جڑ ان لوگوں کی کاٹ دی گئی جو ظلم پہ کمر باندھے تھے۔ اور اس کے لئے سزاوارِ شکر ہے اللہ، سارے جہانوں کا پروردگار!'' جو لوگ اپنی ذات سے فتنہ ہوں، اور ہدایت کی آسمانی تدابیر کے مقابلہ میں ان کا وجودِ فساد خلق کا موجب ہو، اللہ کی ربُ العالمینی تقاضہ کرتی ہے کہ زمین کو ایسوں سے پاک کر دیا جائے۔ اور کیا شبہ کہ یہ مخلوق کے حق میں رحمت ہے اور لائقِ شکر وحمد۔

☆☆☆

حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب ☆

نئی نسل کے علماء وفضلاء کے نام ایک دردمندانہ پیغام

[محترم المقام مولانا محمد عبدالقوی صاحب ہمارے ملک کے ہم عصر علماء میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، فکر کی سلامتی وپختگی، علم میں رسوخ اور عمل میں استقامت کے لحاظ سے وہ اکابر واسلاف کے طرز کے پوری طرح وارث نظر آتے ہیں، بارک اللہ فی حیاتہ

اب سے ۳۰ سال پہلے اپنی مادر علمی اور حیدرآباد کے مشہور تعلیمی ادارے دارالعلوم حیدرآباد میں جلسۂ ختم بخاری کے موقع پر انہوں نے ذمہ داران دارالعلوم کی فرمائش پر کچھ معروضات ایک مقالہ کے طور پر پیش کی تھیں۔ کچھ عرصہ قبل وہ مقالہ نظر ثانی اور حذف واضافہ کے بعد انہوں نے شائع بھی کردیا۔ حال ہی میں حیدرآباد کے ایک سفر کے موقع پر وہ رسالہ انہوں نے راقم سطور کو عنایت فرمایا۔ مطالعہ سے بہت نفع ہوا، اپنی حالت زار پر بہت شرم آئی، خیال ہوا کہ اسے اپنی برادری کے زیادہ سے زیادہ حضرات تک پہونچایا جائے، شاید کہ لوگ عملی نفع اٹھالیں۔۔۔ گنجائش کی کمی کی وجہ سے کچھ فقرے حذف بھی کرنے بڑے ہیں ——— مدیر]

الحمدللہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد

قال اللہ تعالی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۱۱۹

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: **لکل شی معدن ومعدن التقوی قلوب العارفین**

میرے دوستو اور ساتھیو!

آج آپ کو دستار فضیلت عطا کر کے ملت کی اصلاح وفلاح، ان کی قیادت ورہنمائی اور دعوت الی اللہ کی وہ عظیم ترین وگراں بار ذمہ داری اساتذہ کرام کی جانب سے سونپی جارہی ہے جس کے لئے پہلے انبیاء ورسل

☆ ناظم ادارہ اشرف العلوم، حیدرآباد

تشریف لایا کرتے تھے اور جو ہمارے نبی ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلہ نبوت کے اختتام کی وجہ سے امت کے علماء کرام کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔اس لئے میں اس موقعہ پر ایک مخلص رفیق وصدیق کی حیثیت سے آپ کو وہ مضمون یاد دلانا چاہتا ہوں جس کے بغیر اس ذمہ داری سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔جس کی اگرچہ ہر زمانہ میں اہمیت سمجھی گئی تھی مگر اس زمانے کے حالات کے پیش نظر اس مضمون کے مذاکرہ اور مطالبہ کی ضرورت اور زیادہ ہوگئی ہے۔اور وہ مضمون ہے ''**تکمیل دین میں صحبت کاملین کی اہمیت**''۔

میرے دوستو! اتنا تو ہم سب جانتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اجتماعی وتمدنی مزاج کا حامل ہے۔ایک دوسرے کو نفع یا نقصان کا پہنچنا فطری امر ہے۔المرء علی دین خلیله (مسند احمد) مثل الجلیس الصالح والسوء کحامل المسک ونافخ الکیر (مسند المکثرین ۸۰۶۵) المرء مع من أحب (بخاری کتاب الادب ۵۷۰۲) اوران جیسی دیگر احادیث شریفہ نیز قرآن مجید کی آیات مقدسہ اس پر شاہد ہیں کہ انسان کا بناؤ بگاڑ ماحول سے جس قدر متعلق ہے اتنا کسی اور چیز سے نہیں ہے۔کتنے ہی برے لوگ آئے دن اچھی صحبت کی برکت سے نیک وکار،اور کتنے ہی اچھے لوگ برے ماحول کی بدولت بدکار ہوتے رہتے ہیں۔عیاں راچہ بیان؟

اور جہاں تک اخلاق کی تربیت کا معاملہ ہے تو اس کے لئے مناسب ماحول اور اچھی صحبت کے علاوہ ایسے شخص کی بھی ضرورت پڑتی ہے جو تربیت کے راستہ پر ہم سے پہلے چل چکا ہو اور راہ کے نشیب وفراز سرد وگرم کا پختہ تجربہ رکھتا ہو۔

پھر یہ چونکہ ایک فطری وخلقی معاملہ ہے اس لئے ایک اخلاق ہی کیا ہر لائن میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔چنانچہ امور دنیویہ میں بھی کاملین کی صحبت ہی آدمی کے باکمال ہونے کا اطمینان دلاتی ہے۔دیکھئے کسی ڈاکٹر کو برسہابرس کی تعلیم کے بعد بھی ڈاکٹر ہونے کی سند اس وقت تک نہیں دی جاتی جب تک کہ وہ سینئر ڈاکٹرز کی زیر نگرانی وسرپرستی معتدبہ عرصہ تک کام نہ کرلے،کوئی انجینئر محض تعلیم سے اس وقت تک عملی کردار ادا نہیں کرسکتا نہ ہی لوگ اپنے کاموں کے سلسلہ میں اس پر اعتماد کرتے ہیں تاوقتیکہ ماہر وپختہ کار انجینئر کے ساتھ کچھ عرصہ رہ کر عملی تجربہ نہ کرلے۔کوئی لائر،قابل ایڈوکیٹ اس وقت تک نہیں کہلاتا نہ عوام وخواص میں قبولیت حاصل کرسکتا ہے جب تک کہ کسی سینئر ایڈوکیٹ کے جونیئر ہونے کا شرف حاصل نہیں کرلیتا۔یہی بات تمام علوم وفنون میں دنیا کے ہر عقل مند کے نزدیک مسلم ہے۔پس جب یہ بات عقل ونقل دونوں اعتبار سے مسلم ہے تو یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ عین اسی فطرت کے مطابق انسان کے اعمال واخلاق

کی اصلاح اور علم و عمل میں موافقت کیلئے بھی اس سلسلہ میں وارد شدہ وعدوں اور وعیدوں مدحتوں اور مذمتوں کا ''**علم محض**'' مفیدِ مقصد تو ہوسکتا ہے کافی نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ علماء ربانیّین اور مشائخ کاملین کی صحبت و معیت معتد بہ زمانہ تک حاصل نہ ہو اور ان کی نگرانی میں معلومات کو معمولات میں تبدیل نہ کرلیا جائے۔ اس وقت تک آدمی کی انسانیت مکمل ہوتی ہے نہ اسلامیت!

یہی وجہ ہے کہ پروردگار عالم نے انسانیت کے لئے قائم کردہ ''**نظام ہدایت**'' میں ''**انزال کتب و صحف**'' کے ساتھ ساتھ ''**ارسال انبیاء ورسل**'' کو بھی ضروری سمجھا۔ چنانچہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں ''**نبی بغیر کتاب**'' تو ہزار بار تشریف لائے لیکن ''**کتاب بغیر نبی**'' کے ایک بھی نہیں بھیجی گئی۔

برادران عزیز و یاران سبیل!

اسی طرح میں آپ کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرانا چاہوں گا کہ حق تعالی نے قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد جہاں یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (البقرہ ۱۲۹) بتلایا ہے وہیں پر ان کی بعثت کی ایک دوسری غرض وَيُزَكِّيْهِمْ بھی قرار دی ہے۔ خود آپ ﷺ نے بھی اپنی شناخت اگر کبھی **بعثت معلما** کے ذریعہ کرائی تو کبھی **بعثت لاتمم مکارم الاخلاق** (رواہ البخاری فی الادب المفرد، رقم ۲۷۳) کے عنوان سے بتلائی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ علم، بلا عمل اور عمل، بلا تزکیۂ باطن وتصفیۂ اخلاق قبولیت کے لائق ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ علم کے ساتھ عمل کا جڑنا اور عمل کے ساتھ اخلاص وللّٰہیت اور خدا ترسی کا جمع ہونا ضروری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز بلا صحبت کاملین و معیت صادقین کے حاصل ہونا عادۃً ممکن نہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں تمام اہل ایمان کو مخاطب کر کے ''**صادقین**'' کی معیت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ ۱۱۹) ''اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اور (اس کے لئے) صادقین کی صحبت اختیار کرو'' آپ غور فرماویں کہ حصول تقوی کا ذریعہ اللہ تعالی نے وفور علم یا کثرت معلومات کو نہیں بتلایا بلکہ صحبت صادقین کو قرار دیا ہے۔ اسی طرح حضرت نبی کریم ﷺ نے بھی تقویٰ اللہ و تعلق مع اللہ کی دولت کو کتابوں کے صفحات پر ڈھونڈنے کے بجائے عارفین کے قلوب سے اخذ کرنے کی تاکید فرمائی ہے **لکل شی معدن و معدن التقوی قلوب العارفین**، اسی کو حضرت حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں ؎

ان سے ملنے کی ہے یہی اک راہ ملنے والوں سے راہ پیدا کر

اور مولانا روم بہت پہلے فرما چکے ہیں ۔

بے عنایات حق وخاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

دوستو! عارفین وصادقین کی معیت وصحبت کا حکم اور اس کی اہمیت تو معلوم ہوگئی، اب دیکھنا یہ ہے کہ صادقین کون ہیں؟ ۔۔۔ وہی اصحاب علم وعمل جن کی زندگی امتثال اوامر واجتناب نواہی کا مظہر جمیل بنی ہوئی ہے أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (البقرہ) معلوم ہوا کہ متقین ہی صادقین ہیں۔ پھر تقویٰ کی حقیقت احکام کی بجا آوری اور نواہی ومناہی سے احتراز واجتناب ہے۔ التقوىٰ هى محافظة أداب الشريعه, و مجانبة كل ما يبعد ک من الله تعالىٰ ''آداب شریعت کی حفاظت اور اللہ تعالیٰ کی رضا سے دور کرنے والے اعمال سے اجتناب تقویٰ ہے''۔ اب رہ گیا یہ کہ یہ اہل صدق وصفا کی معیت ومصاحبت کس قدر ہونی چاہئے؟ تو اس کا جواب صاحب روح المعانی علامہ سید محمود آلوسی بغدادی نے لتکونو امثلهم (روح المعانی ۷/۴۷) سے تفسیر کر کے دے دیا ہے۔ یعنی ان کی معیت اتنی ہونی چاہئے کہ تم خود بھی ویسے ہی ہو جاؤ اور اسی رنگ میں رنگ جاؤ۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں اہل اللہ ہمیشہ صحبت صالحین وکاملین کا اہتمام فرماتے ہیں۔ اس کے لئے دعائیں مانگتے اور اپنے چاہنے والوں کو بھی اس کی تلقین فرماتے رہے۔

ہندوستان کے مشہور مشائخ میں مرزا مظہر جان جاناںؒ سے اہل علم میں کون ناواقف ہوگا۔ صحبت صالحین کی افادیت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اگر مجھے شب قدر مل جائے تو میں اس میں اللہ تعالیٰ سے صحبت صالحین ورفاقت کاملین کی نعمت طلب کروں گا''۔

انہی کے خلیفہ تفسیر مظہری کے مصنف، فقیہ وقت، بیہقی الہند حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اپنی معروف ومتداول کتاب ''مالا بد منہ'' ۔۔۔ جس کو ہم لوگ ابتدائے درس نظامی ہی میں پڑھ چکے ہیں ۔۔۔ میں ''کتاب الحج'' کے اختتام پر ''کتاب الاحسان'' کا آغاز کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جو کچھ ہم نے گذشتہ صفحات میں بیان کیا ہے وہ شریعت کا ظاہر اور پوست تھا، یہاں سے شریعت کے باطن اور اس کے مغز کو بیان کرتے ہیں۔ اور معلوم ہونا چاہئے کہ مغز شریعت ''کتابوں میں نہیں'' اللہ والوں اور خدا رسیدہ بزرگوں کی صحبت میں ملتا ہے۔ حقیقت ''یعنی مغز شریعت جسے اصطلاح میں تصوف وسلوک کہا جاتا ہے'' کو شریعت سے علیحدہ نہ سمجھنا چاہئے کیوں کہ ایسا سمجھنا کفر وجہل ہے۔ آگے فرماتے ہیں ''بہر حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باطنی انوار وبرکات کو اہل اللہ کی صحبتوں اور خدمتوں سے حاصل کر کے اس نور مبارک سے اپنے سینوں کو منور ومجلی کرنا چاہئے۔''

اسی طرح مشہور فقیہ وصاحب فتوی عالم ابن عابدین شامی فقہ حنفی کی اپنی مایۂ ناز تصنیف کے مقدمہ میں فرماتے ہیں ''حسد، عجب، کبر وغیرہ امراض باطنی کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر اسی طرح فرض عین ہے جس طرح دیگر فرائض ظاہرہ'' اور ظاہر ہے کہ اس حساس ولطیف علم کا ادراک بغیر تجربہ وصحبت کاملین کے محض کتابوں سے نہیں ہوسکتا۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فقہاء ظاہر بھی فقہ باطن کے قائل ہیں اور صرف ضرورت کے نہیں فرض عین ہونے کے قائل ہیں۔ اسی لئے امام ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں کہ ''ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی استاذ ومربی ہو، اس لئے کہ جس نے ایسا نہیں کیا وہ کبھی فلاح یاب نہیں ہوا''۔ شیخ ابوعلی دقاق فرماتے ہیں ''خودرو پودے اکثر جلانے کے ہی کام آتے ہیں اور غارس وکاشتکار کی نگرانی میں پروان چڑھنے والے درختوں سے پھل پھول برگ وبار دستیاب ہوتے ہیں''۔

غرض یہ کہ سلف صالحین سب کے سب اس ضرورت کے قائل ہیں۔ خواہ علماء ہوں یا فقہا ومحدثین، خواہ ابتدا ہی سے خواہ اواخر ایام حیات میں، اور کیوں نہ ہوتے جب کہ قرآن وحدیث میں اعضاء وجوارح کے ساتھ قلب کو بھی پابند احکام کیا گیا ہے اور ظاہر کے ساتھ باطن کی تعمیر وتصلیح کا حکم دیا گیا ہے تو پھر کس کی مجال ہے کہ علوم ظاہر وباطنہ دونوں کے حصول اور ان کے ماہرین کے وجود کے ضروری ہونے کی مخالفت کرے؟ یہی وجہ ہے کہ مخالفین تصوف وسلوک بھی (جب انہیں اس سے مفر کی کوئی صورت نظر نہ آئی) تو اپنے لٹریچر میں اس مضمون کو مختلف عنوانات سے شامل کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، مگر اسباب عادیہ وعقلیہ سے انحراف کرتے ہوئے محض فلسفیانہ انداز میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ راہ حق کا سلوک ایک عملی شئے ہے۔ فلسفہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

البتہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اسلام کے قرون اولیٰ میں چونکہ صدق وصفائی ظاہراً وباطناً پورے ماحول پر غالب تھی، ہر مسلمان ایک دوسرے کا بصمیم قلب خیر خواہ تھا، اخلاق، اغراض کی جکڑ سے آزاد تھے، ظاہر وباطن میں یکسانیت تھی، تو کاملین کو تلاش کرنے، باقاعدہ اور باہتمام ان کی صحبت کو اختیار کرنے اور تربیت نفس وتزکیہ اخلاق کے لئے مختلف طرق وتدابیر وضع کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے۔ اخبارِ نبوی کے مطابق۔ امت کے دین وتدین، امانت ودیانت اور اخلاص وللّٰہیت میں زوال آتا چلا گیا اور نفاق کی خو بو مسلمانوں میں رچنے بسنے لگی تو سلف صالحین نے جس طرح قرآن کریم کی حفاظت کے لئے

اصول تجوید وتفسیر، حدیث شریف کی حفاظت کے لئے اسماء الرجال اور اصول حدیث اور احکام اسلامی کی حفاظت اوران پر عمل کے رواج کو باقی رکھنے کے لئے اصول فقہ وضع کئے، پھران فنون کومخصوص ترتیبوں اور عنوانات کے تحت مدون کرنے کا فریضۂ عادلہ عطا فرمایا، نیز ان ذرائع کو مقاصد کا موقوف علیہ بن جانے کی وجہ سے (تقریباً) مقاصد کا ہی درجہ عطا کیا، بالکل اسی طرح ''ماہرین علوم باطنہ'' نے بھی ''احسان و سلوک'' کی حفاظت کے لئے کاملین سلوک کے اوصاف کی نشاندہی اور تحصیل وتکمیل سلوک کے طریقوں کی ترتیبیں وضع کیں اورانہیں فنی اعتبار سے مرتب ومدون کیا۔جن میں سب سے اہم چیز شیخ کا اپنے فن میں کامل اورشرع شریف کے احکامات پر سنت کے مطابق عامل ہونا ہے۔اس سلسلہ میں صوفیا کرام کا عقیدہ ہے ؎

گر ہوا میں اڑتا ہو وہ رات دن ترک سنت جو کرے شیطان گن

جنید بغدادیؒ سے پوچھا گیا کہ ایک صوفی نما شخص اپنے خدا رسیدہ اور نماز روزہ سے مستثنیٰ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا ''ہم بھی اس کے پہنچے ہوئے ہونے کی تصدیق کرتے ہیں مگر کہاں؟ جہنم میں!!'' **نحن نصدق و صالہ و لکن الی السعیر**۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ سلف صالحین کے نزدیک صحبت کاملین اور تربیت نفس کی ضرورت دین اسلام کی تکمیل کے لئے تھی، نہ کہ ایک دوسرا دین وضع کرنے کے لئے۔

یہ اور بات ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ جہلاء اور ہوس پرستوں کی ایک جماعت اس راہ میں گھس آئی اور اس نے دین کی ایک اور شکل وضع کرڈالی اور دعویٰ کرنے لگی کہ شریعت اور چیز ہے طریقت اور حقیقت اور شئے ہے۔لیکن میں سنا چکا ہوں کہ ہمارے محقق علماء شریعت وطریقت کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کو جہل وکفر سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک طریق کی حقیقت ''تعمیر الظاہر والباطن'' تھی جو عین شریعت اور مطالبہ قرآن وسنت ہے۔

پھر یہ بات بھی توسنجیدگی سے غور کرنے کی ہے کہ کیا ایسی بدعتیں صرف علوم باطنہ ہی میں پیدا ہوئیں؟ علوم ظاہرہ بدعات سے بالکل محفوظ ہیں؟ ہرگز نہیں! تو پھر بدعات کے اثرات سے بچنے کا جو حل فقہ ظاہر میں نکالا گیا ہے فقہ باطن میں بھی نکالا جاسکتا ہے۔ایسا کیوں نہ کیا گیا؟ اور کیوں اسے بدعت کا نام دے کر سرے سے ترک کردیا گیا، کبھی مصنوعی اشیاء کے مارکیٹ میں آجانے کی وجہ سے آپ ہی بتلائیں کہ اصلی کا استعمال بھی ترک کردیا جاتا ہے؟ یا کہیں بیماریوں کے پھیلاؤ وزیادتی کو دیکھ کر حفظان صحت کی تدابیر ہی چھوڑ دی جاتی ہیں؟ یا اور چوکنا ہوکر ان کے اختیار کرنے میں شدت پیدا کردی جاتی ہے؟ ہر صاحب سمجھ

فیصلہ کرسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خیر القرون اور اسلام کے صدر اول کے گذر جانے کے بعد جب ظاہر و باطن میں اختلاف کے واقعات پیش آنے لگے تو سلف صالحین نے اس کی جانب خصوصی توجہ دی، اور اپنے ایمان کو ''نفاق عملی'' کے اثرات وخطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے قرآن و حدیث کی روشنی میں مؤثر تدابیر کو اختیار فرمانا اور مسلمانوں کو اس کی تاکید کرنا شروع کیا۔اور صحبت صادقین وصالحین کو ہر مسلمان کے لئے دین کی حفاظت کے واسطے لازم قرار دینے لگے.....

میرے دوستو اور ساتھیو!

غور کیجئے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب صاحب علم نہیں تھے، ان میں سے بہت سے تو بہت زیادہ نوافل اور اذکار و اشغال کے پابند بھی نہیں تھے، اس کے باوجود ولایت کا جو مرتبہ ان کو حاصل ہوا اس پر اجماع ہے کہ پوری امت کے اولیاء، ابدال، اقطاب واغواث مل کر ان کے مراتبہ ولایت کو نہیں پاسکتے تو آخر کس وجہ سے؟ اس لئے نہ کہ ان کو اولین وآخرین کے سب سے بڑے کامل، عارف وصادق، خلق عظیم کے حامل مربی یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارکہ نصیب ہوئی تھی اور ان کے بعد اب یہ کسی کے لئے ممکن نہیں ہے۔تو اس فضیلت کا اصل سبب علم وعمل کے بجائے ''**صحبت نبوی**'' ہی قرار پایا۔

اس لئے ہمارے اکابر علماء دیوبند کے یہاں بھی جن کے مسلک کو ہم افراط تفریط سے محفوظ ایک نہایت ہی محتاط ومعتدل مسلک سمجھتے ہیں۔۔۔۔شریعت کے ساتھ طریقت کو، علم کے ساتھ معرفت کو اور جہد وعمل کے ساتھ صحبت کاملین وعارفین کو اعتقاداً وعملاً لازم وملزوم سمجھا جاتا تھا، ان کی زندگیاں اسی جامعیت کا حسین آئینہ اور ان کی تعلیمات اسی حقیقت واقعہ کا لازوال خزینہ تھیں۔

حضرت گنگوہیؒ جیسے فقیہ، حضرت نانوتویؒ جیسے حکیم، حضرت سہارنپوریؒ جیسے محدث، حضرت شیخ الہندؒ جیسے شارح حدیث اور حضرت تھانویؒ و مدنی جیسے جبال علم وفہم کا اپنے اپنے مشائخ کی خدمتوں اور صحبتوں میں رہنے کے لئے (باوجود اپنی تمام تر علمی وتحقیقی مصروفیات کے) وقت نکالنا، ان کی نگرانی ورہنمائی میں سراپا اطاعت ہوکر ریاضت ومجاہدہ کے مراحل سے اپنے آپ کو گذارنا اور اپنے سب کمالات کو وسائل و اسباب کی نسبت سے انہی کی نگہ عنایت اور صرف ہمت کی برکت تصور کرنا کیا کوئی شعبدہ بازی ہے یا کسی حقیقت کی عکاسی؟ پھر کیا ہم جیسوں کے لئے جو انہی بزرگوں کی عظمت سے منسوب ہوکر اور اِن ہی کا نام لیکر اپنا مقام ومرتبہ جتاتے پھرتے ہیں عبرت وموعظت حاصل کرنے کے لئے اس میں کوئی سبق موجود نہیں ہے؟

اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر کبھی ہم نے غور کیا کہ ان بڑے بڑے علماء کو جن کے پاسنگ کو بھی آج ہم نہیں پہنچ سکتے آخر کیوں اپنے اپنے زمانہ کے صاحب نسبت و حامل طریقت بزرگوں کی خدمت میں پہنچنے، ان کے سامنے زانوئے سلوک طئے کرنے اور ان کی رہنمائی میں خود کو اور خودی کو فنا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی؟

میں آپ کو ان میں سے چند قدیم و جدید ایسے علماء کی خدمت میں لے چلنا چاہتا ہوں جنہوں نے ''**تعلیم و تزکیہ**''، ''**شریعت و طریقت**'' اور ''**تعمیر ظاہر و باطن**'' کو جمع کر کے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو سدا بہار و لازوال بنالیا تھا، وہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ہمارے قلوب آج بھی ان کی عظمت و محبت سے بھرپور اور علم و عمل سے مرعوب ہیں۔

۞ یہ ہیں امت کے علماء میں ایک عظیم المرتبت عالم دین، مشہور زمن و آبروئے فکر و فن، حجۃ الاسلام و مقتدائے انام سیدنا الامام الغزالیؒ۔ علم و فضل کا حال یہ ہے کہ تکمیل علوم کے بعد جب نیشاپور سے واپس ہونے کا ارادہ فرمایا تو اپنے وقت کے جلیل القدر عالم دین اور ان کے استاذ گرامی ابو المعالی امام الحرمینؒ نے شہر سے باہر نکل کر انہیں رخصت کیا۔ رخصت کرتے ہوئے اپنے اس ۲۷ سالہ نوجوان شاگرد کے بارے میں یہ شہادت دی کہ وہ اس زمانے کے ''**امام العلماء**'' ہیں، جب وہ بغداد کے جامعہ نظامیہ میں مسند صدارت پر فائز کئے گئے تو ان کے علم و فضل سے فائدہ اٹھانے والوں میں نوجوان طالبان علوم کے ساتھ ساتھ کبیر السن علماء کرام بھی شریک رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے جامعہ نظامیہ بغداد کو جو شہرت، قبولیت اور عظمت و حشمت کا جو مقام ملا تاریخ گواہ ہے کہ وہ دربار شاہی کو بھی حاصل نہ ہوا تھا۔

اس سب کے باوجود جب تائید غیبی سے انہیں اپنے نفس کی تربیت اور اخلاق کی اصلاح کی فکر نصیب ہوئی تو عزت و رفعت کے ان ظاہری مرتبوں، سربلندی و بلند پروازی کے پرفریب نقشوں اور دلربا منظروں سے اپنے آپ کو علاحدہ کر کے نیز طلباء علماء کے ایک جم غفیر کو ان کے اصرار کے باوجود نظر انداز کر کے بغداد کو خیرآباد کہہ دیا۔ دمشق پہنچ کر وہاں کے ایک شیخ کامل کی صحبت و معیت اختیار فرمالی۔ ان کے زیر سایہ و موافق ہدایت ذکر و شغل میں مصروف ہو گئے۔ آپ غور کیجئے کہ علوم ظاہرہ و مناصب عالیہ میں آخر وہ کونسی چیز تھی جو الامام الغزالی کو بغداد میں میسر نہ تھی؟ اگر کچھ کمی تھی تو ظاہر ہے کہ بس اسی صحبت و معیت کی برکات اور علم و ہنر کے حقیقی ثمرات کی کمی تھی۔ جس کی جستجو و طلب نے انہیں عز و شرف،، مقام و مرتبہ، راحت و آرام سب سے بے نیاز کر دیا تھا۔ پھر اس عرصہ میں شیخ کامل کی صحبت و معیت اور ذکر و شغل کی پابندی سے انہوں نے جو کچھ پایا اور جس دولت بے بہا کو حاصل کیا اس پر وہ اس قدر مسرور و مطمئن ہوئے کہ اس راہ میں

جن دولتوں کی قربانی کرنی پڑی تھی اور جن مرتبوں کو ٹھکرانا پڑا تھا اس کا چنداں فکر وغم ان پر نظر نہ آتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس عالم ربانی نے اس صحبت و تربیت میں کیا نفع محسوس کیا اور کس طرح اپنے معاصرین و ناقدین کے سامنے اس کا برملا اظہار کیا؟ سنئے اور انہیں کی زبان سے سنئے ''المنقذ من الضلال'' میں ان کے اعترافات کا خلاصہ ہے۔

''ہم پہلے جب دین کی خدمت، علم کی اشاعت کرتے تھے تو اس سے ہمارا مقصد صرف حب مال وجاہ ہی ہوا کرتا تھا اور اب خلوص وللّٰہیت کا حال یہ ہے کہ ایک لفظ بھی ہماری زبان سے رضائے الٰہی کے علاوہ کسی اور نیت سے نہیں نکلتا''

۞ تقریباً یہی حال رمز آشنائے شریعت، نکتہ دان طریقت، عالم و عارف مولانا جلال الدین رومیؒ کا بھی ہے۔۔۔۔ جن کی مثنوی شریف احسان وسلوک کے مسائل حل کرنے اور اوہام وشکوک کو زائل کرنے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور جو صدیوں سے اہل اللہ اور سالکین راہ طریق کے لئے دردِ دل کی دوا اور مرض غفلت کے لئے سبب شفاء بنی ہوئی ہے۔۔۔۔ مولانا بھی شروع میں ''ملائے خشک'' تھے، لیکن جب شمس الدین تبریز جیسے صاحب نظر واہل دل اللہ والے کی نظر فیض اثر نے ان کے دل میں درد محبت کی آگ جلادی اور یاد الٰہی کی تڑپ پیدا کردی تو ان کی نظر میں اپنے لئے مولائے روم کا لقب، طالبان علم کا ہجوم، پاپوش برداروں اور حاشیہ نشینوں کی حقیقت، حتی کی بادشاہ وقت خوارزم شاہ کی عقیدت مندی و پالکی برداری، بے حیثیت اور ہیچ در ہیچ ہوکر رہ گئی۔ اک درد سا دل میں اٹھ گیا تھا۔ اک آگ سی روح میں لگ گئی تھی، طبیعت تھی کہ کسی ان دیکھی دولت ولذت سے محرومی کے احساس سے بے چین! اور عقل اس کے حصول کی تدبیروں میں مگن ومشغول!! نہ اغیار کی تنقیدوں وتنقیصوں کی پرواہ! نہ اپنوں کی طعن وتشنیع کا خوف! بہرحال سب طرف سے یکسو ہوکر اسی صاحب دل واہل نظر اللہ والے کا دامن تربیت صبر وثبات کے ہاتھوں تھام لیا۔ اور انہی کی صحبت ومعیت کو مقصد حیات بنالیا۔ کچھ ہی دن مجاہدوں اور ذلت ومسکنت کے راستوں سے گذرنے کے بعد وہ وقت بھی آیا کہ اپنے ان علوم میں جو لفظ وبیان تک محدود تھے کیف ولذت کی خوشبو آنے لگی۔ ایسا کیف، ایسی لذت کہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس کے سامنے پرکاہ سے حقیر تر، دل ودماغ میں وہ معارف وحِکم کے چشمے ابلنے لگے کہ فنون ایران وعلوم یونان ان کے روبرو گرد راہ سے بدتر، آنکھوں کو وہ سرمۂ بصیرت ملا کہ نگاہیں مظاہر کی رکاوٹوں کو توڑ کر ان میں مخفی حقائق کا پتہ چلانے لگیں۔ قلب کو ذکر الٰہی کا وہ چسکا لگا کہ دنیا کی ہر لذت اس کے مقابلہ میں بے حیثیت ہوکر رہ گئی۔ غرض علم، صحیح معنوں میں علم بن گیا اور عقل،

حقیقت میں نورِ علم سے منور ہوگئی تو بے ساختہ اعتراف کیا اور پکار اٹھے ؎

مولوی نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریزی نہ شد

۞ یہ محقق تھانویؒ ہیں بڑے عالم، زبردست مفتی، مایہ ناز خطیب، عظیم تر مصنف، مفسر قرآن اور پیر طریقت! حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر ہیں سراپا اطاعت ہیں، اپنی ہستی کو مٹا رہے ہیں، آخر کچھ تو پا رہے ہوں گے کچھ مل رہا ہوگا کسی کمی کی تکمیل اور تشنگی کی تسکین ہو رہی ہوگی۔ ورنہ آخر اتنے بڑے عالم کو کیا ضرورت پڑی تھی وہاں جانے کی؟ علم وفن کے اعتبار سے کیا کچھ نہیں تھا۔ عزت وشہرت میں کیا کسر تھی۔ پھر کسی شیخ کامل کی احتیاج کیوں محسوس کی گئی، اور پھر اس مجاہدہ وصحبت کی برکت سے کیا پایا؟ انہی سے پوچھئے وہ اعتراف کر رہے ہیں ؎

خودی جب تک رہی اس کو نہ پایا جب اس کو ڈھونڈ پایا تو خود عدم تھے
تمہاری کیا حقیقت تھی میاں آہ! یہ سب امداد کے لطف و کرم تھے

اسی نسبت وصحبت سے پہلے اور بعد کی قلبی وروحانی صورت حال کو بھی ذرا دیکھئے کس طرح مستانہ وار بیان کر رہے ہیں۔

جلا کردہ ٔ دستِ دلدار ہوں میں سیہ دل تھا اب پر انوار ہوں میں
سنوارہ کس درجہ بگڑے ہوئے کو مجھے دیکھ! آئینہ یار ہوں میں

پھر خانقاہ تھانہ بھون میں بڑے بڑے علماء کی موجودگی میں علمی نکتے بیان ہو رہے ہیں۔ تصوف کی گرہیں کھولی جا رہی ہیں۔ قرآنی علوم وحکم پر سے پردے اٹھائے جا رہے ہیں، احادیث مبارکہ کی مشکلات دور کی جا رہی ہیں، فقہی جزئیات واشگاف ہو رہی ہیں، دریں اثنا کسی صاحب علم کی زبان سے بے ساختہ داد تحسین وآفرین نکل جاتی ہے۔ اس کو سن کر ذہن اس سرچشمۂ برکات کی طرف چلا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے دل سیاہ کو پُرانوار بنانے کے لئے اسباب کی اس دنیا میں منتخب کیا تھا۔ جواب میں زبان گویا ہوئی تو بایں الفاظ ؎

یہ سب حضرت حاجی صاحب کی برکت ہے

کسی نے آخر سوال کر ہی لیا کہ حضرت! یہ جو علوم آپ بیان فرماتے ہیں، ہم بھی تو عالم ہیں، ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملے، آخر آپ کونسی کتابوں کا مطالعہ فرماتے ہیں؟ غور سے سنئے جواب کیا ارشاد ہو رہا ہے؟

میں نے ''کتب'' تو زیادہ نہیں دیکھیں البتہ چند ''قطب'' کو دیکھا اور ان سے فیض اٹھایا ہے۔

یعنی حضرت حاجی صاحبؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا یعقوب صاحب وغیرہ۔

۞ یہ محدث کشمیری ہیں، پورا ہندوستان جن کے علم وفضل کے چرچوں سے گونج رہا ہے، کبھی عربی میں بات شروع ہوتی ہے تو پورا گھنٹہ عربی چل رہی ہے، لگتا ہے کسی قدیم عربی عالم کا درس ہے، کبھی فارسی میں تو فارسی ہی میں گویا ہیں۔ سبق کیا ہے؟ علم وتحقیق کی میزان پر بڑے بڑوں کو لایا اور تولا جارہا ہے، ذہانت و فطانت، عقل وفراست، علم وتحقیق اور حفظ و یادداشت میں، کہا جاتا ہے کہ، تاریخ گذشتہ پانچ صدیوں میں اس شخص کی نظیر نہیں پیش کرسکی۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے نہیں، اقطاع عالم سے طالبین وشائقین شرف تلمذ حاصل کرنے کے لئے کھنچے چلے آرہے ہیں، طلبہ تو طلبہ، اساتذہ جسے دیکھ کر حیران ہیں اور انہیں قدرت کی ایک نشانی، اسلام کا ایک معجزہ قرار دیا جارہا ہے۔ جس کے درس حدیث میں شرکت اور تبادلۂ خیال واستفادۂ علم کے بعد۔۔۔۔۔ باوجود مسلکی اختلاف کے۔۔۔۔ یمن کے ایک زبردست عالم علی یمنی دارالعلوم کی مسجد قدیم میں طلبۂ مدرسہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرنے پر مجبور ہیں کہ

لو حلفت انہ اعلم بابی حنیفہ لما حنثت

.....اور جس کی ایک مختصر سے تقریر کے دوران بار بار اپنی جگہ سے بے ساختہ کھڑے ہوکر مصر کے مشہور عالم علامہ رشید رضا **واللہ ماریت مثل ھذ العالم قط** کی داد دیتے جارہے ہیں۔ اس سب کے باوجود دیکھنے والوں کی آنکھوں نے دیکھا اور قلم نے شہادت رقم کی کہ یہی محدث عظیم دن بھر اپنی درسگاہ میں علم وفضل کے موتی بکھیرنے کے بعد شام کو اپنے استاذ اور شیخ ومرشد حضرت شیخ الہندؒ کی مجلس شریف کے ایک گوشہ میں دوزانو باادب وسراپا احترام بیٹھ کر پنکھے کی ڈوری کھینچنے میں مشغول ہے۔ اللہ اکبر! آپ غور کرسکتے ہیں کہ علمی کمالات اور عرفی مراتب ہی اگر سب کچھ ہوں تو محدث کشمیری کو کونسی حاجت ان علمی وعملی سرفرازیوں اور نیک ناموں کے باوصف بارگاہ شیخ میں پہنچارہی اور اپنے کو مٹانے، چھوٹا بنانے، عقیدت وخدمت کا بارگراں اٹھانے پر مجبور کررہی ہے۔ آخر وہ کیا چیز تھی جو انہیں کتابوں، درسگاہوں میں حاصل نہیں ہوسکی تھی جو لٹریچر کے صفحوں ولائبریری کی الماریوں میں دریافت نہ ہوسکی تھی جو عقل وخرد، ذکاوت وفراست کی جو لانیوں میں مل نہ سکی تھی، جو درس وتدریس، وعظ وتصنیف کی مشغولیتوں میں بھی نصیب نہ ہوسکی تھی؟؟ اور تھی ایسی اہم اور ضروری کہ کوئی مشغولی اس کے فکر وحصول میں مانع ہوسکتی تھی نہ ہی کوئی مقام ومرتبہ اس کی سعی میں حائل ہوسکتا تھا! پھر یہی نہیں کہ صرف خود ہی کو اس جنون ودیوانگی میں مبتلاء کرنے میں اکتفا کررہے ہوں بلکہ اپنے ان محبوب تلامذہ کو بھی جنہوں نے آٹھ برس کی مسلسل محنتوں، دن رات کی کاوشوں کے بعد جب علوم آلیہ وعالیہ کی تحصیل سے فراغت کی سند حاصل کی تھی، انہیں بھی دستار فضیلت عطا کرتے ہوئے تاکیدی نصیحت اور

وداعی کلمات اگر فرمائے جارہے ہیں تو اسی دیوانگی کی تلقین کے ساتھ کہ ''تم عالم حقیقی کہلانے کے اس وقت تک مستحق نہیں ہوسکتے جب تک کہ کسی اللہ والے کی صحبت میں چند دن رہ کر جوتیاں نہ سیدھی کرلو''۔

جوتیاں سیدھی کرنے کے جملے سے بعض ظاہر پرست دھوکا نہ کھاویں کہ یہ کونسی عبادت اور شرعی معاملت ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ ''جوتیاں سیدھی کرنا'' اس زمانہ میں ایک محاورہ بن گیا تھا اور اپنے کو فنا کرنے اور نفس کو منقاد و مطیع بنانے سے تعبیر تھا۔

۞ ان سے ملئے! یہ مولانا مدنیؒ ہیں، شیخ الاسلام، حجۃ الانام، دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث کی زینت، جمعیۃ العلماء ہند کی آبرو، مجاہد مرتاض، جنگ آزادی کے عظیم رہنما، جنہیں مدینہ منورہ میں مسجد نبوی شریف میں بیٹھ کر حدیث رسول ﷺ کی تدریس کا شرف حاصل ہے۔ بڑے بڑے علماء، رؤسا اور شہزادے تک جن کی عقیدت کے اسیر ہیں۔ مدینہ منورہ سے اس زمانہ کی تمام تر سفری صعوبتوں اور مصیبتوں کو سہتے ہوئے ہندوستان پہونچتے ہیں۔ دیوبند سے گنگوہ تک رات کی تاریکی میں پیدل چل کر دیوانہ وار شیخ گنگوہی کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے اور معلوم کیا جاتا ہے کہ حاضری کا مقصد کیا ہے؟ جواب میں بصد احترام اپنا مدعا جو عرض کیا جاتا ہے تو وہ یہ ہیکہ ''میں کوئی دنیاوی مقصد یا نفسانی غرض سے نہیں آیا ہوں، میرا مقصد ذات حق سبحانہ، کے سواء اور کچھ نہیں ہے''۔

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ علم و عمل کے اس پیکر مجسم کو مسجد نبوی کے مبارک ماحول میں حدیث رسول کی خدمت اور حرمین شریفین کی مقدس فضاؤں میں دین اسلام کی دعوت جیسی نعمتوں کے نصیب ہونے کے باوجود آخر وہ کیا چیز تھی جس کی کمی ''ذات حق سبحانہ وتعالیٰ'' تک پہونچنے کے راستے میں رکاوٹ تھی، اور جس کی وجہ سے انہوں نے اس زمانہ کے سفر کی صعوبتوں مشقتوں کو گوارہ کرتے ہوئے اور حرمین شریفین کے قیام کی سعادتوں تک کو چھوڑتے ہوئے ہندوستان پہنچے تھے، دھیان دیا جائے کہ یہ کسی ان پڑھ جاہل کا غلو فی العقیدت نہیں ہے۔ ایک بڑے متبحر عالم دین کا سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔ ایسے عالم کا جس کی زندگی کا ہر لمحہ جہد و عمل سے تعبیر تھا اور جسے لغو لایعنی سے گویا طبعی نفرت تھی۔ اگر ہم اس اقدام کی وجہ انہی سے پوچھ سکتے تو وہ شاید بہادر شاہ ظفر کی زبان میں ہم کو یہ جواب دیتے۔

نہ ہم نے کچھ ہنس کے پایا ہے، نہ کچھ رو کے پایا ہے
جو کچھ ہم نے پایا ہے، کسی کا ہو کے پایا ہے

۞ انہیں دیکھئے یہ علامہ بلیاویؒ ہیں۔ دارالعلوم کے شیخ المعقولات، ناظم تعلیمات، صحیح مسلم کے استاذ اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے گنجینۂ بے مثال، اس سب کے باوجود دھیان جب تربیت وتزکیہ کی طرف جاتا ہے تو بے چین ہو اٹھتے ہیں، چہار طرف نظر دوڑاتے ہیں، پتہ چلتا ہے کہ اکابر تو سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، بزرگوں کی تربیت گاہیں سونی ہو رہی ہیں یا خود کو ان سے مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر چھوٹوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو نظر اپنے ہی ایک تلمیذ رشید مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہؒ پر جا کے رکتی ہے۔ ضمیر ان کے مراتب سے مطمئن، طبیعت ان کی فکر وفن سے مانوس دکھائی دیتی ہے۔ فوراً ایک درخواست پوری عاجزی ونیازمندی کے اسلوب میں لکھ کر روانہ فرمائی جاتی ہے کہ اس آخری وقت میں میری دستگیری فرمائی جائے للہ للہ! ایک ذی مرتبت وعالی مقام استاذ اپنے شاگرد کے سامنے کس طرح زانوئے سلوک طے کر رہا ہے۔ دیکھئے پہلے خط میں کیا لکھ رہے ہیں:

> ''چونکہ کوئی بیس پچیس سال سے گوناں گوں امور میں مبتلا ہونے کی وجہ سے امر آخرت مبہم ہو گیا ہے۔ اس لئے بعض اوقات قلب کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ آنجناب اس طرف پوری قوت سے متوجہ ہوں۔ ورنہ آپ کا یہ کبیر السن بے مایہ استاذ تباہ ہو جائے گا''

سبحان اللہ! کوئی ٹھکانہ ہے اس فکر آخرت اور اس کے لئے اپنے آپ کو کسی شیخ کامل، متبع سنت، مصلح ومربی کی خدمت میں سراپا اطاعت بنکر خود سپرد ہو جانے کا؟

سوال یہ ہے کہ اتنے بڑے عالم دین، محقق ومدرس حدیث کو اس عمر میں پہنچ کر آخر وہ کونسی کمی کا احساس تھا جو کھائے جا رہا تھا۔ اور جس کے لئے اپنے کسی بڑے اور بزرگ کا بھی نہیں، چھوٹے بلکہ شاگرد کا اسیر عقیدت واطاعت ہونے پر انہیں مجبور کر رہا تھا؟ انہی سے سنئے فرما رہے ہیں کہ (باوجود دینی مشغولی اور عملی پابندی کے بھی) ''فکر آخرت مبہم'' اور ''قلب کی حالت دگرگوں'' ہو رہی تھی۔ اس اہم صفت کی کمی اور محرومی کے احساس نے انہیں بارگاہ مصلح الامت میں پہنچایا اور پھر جب ان کی رہنمائی میں صفائے قلب کے مراحل اور فکر آخرت کی منازل طے ہونے لگیں تو دل کو قرار واطمینان حاصل ہوا۔

سوچئے اور بار بار سوچئے کہ اتنے بڑے فقیہ واستاذ حدیث کو بھی دل کی حالت خود بخود درست کر لینا نہیں آتا تھا؟ جاہل تو خیر جاہل ہی ٹھہرے، علماء کو بھی کیا راہ حق کو سلوک میں راہنما کی ضرورت پڑتی ہے؟ جواب انہی کے طرز عمل میں تلاش کیجئے، اور نہ سمجھ آئے تو عارف باللہ حضرت پرتاب گڑھیؒ سے معلوم

کیجئے وہ جواب دیں گے ۔

تنہا نہ چل سکو گے محبت کی راہ میں
میں چل رہا ہوں، آپ میرے ساتھ آیئے

۞ ان سب کے استاذ ، استاذ الاساتذہ ، شیخ المشائخ ، دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرس، مسند حدیث کے وقار، ہندوستانی مسلمانوں کے لئے باعث صد افتخار، پورے عالم اسلام کے ہمدرد وغمگسار، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے محرک وبانی، زندگی کے ایک ایک لمحہ کو بروئے کار لانے والی شخصیت، شیخ الہند حضرت محمود الحسن صاحبؒ بھی ملاحظہ کیجئے ۔ کیسا مبارک ماحول اور کیسی عظیم ومقدس مشغولیتیں تھیں ان کی ! مگر نہ ان مشاغل پر قناعت ہے اور نہ ہی ان اعمال ظاہری پر اطمینان ! ہفتہ بھر خدمت علم میں مشغول رہنے کے بعد اِدھر جمعہ کی چھٹی ہوئی اور اُدھر شب ہی کو اپنے پیر ومرشد کی خدمت میں تلاشِ حق کی بے چینی لئے اور سراپا ادب ومجسمۂ احترام بنے حاضر ہوجاتے تھے ۔ کیا ملتا ہے حضور ! آپ کو گنگوہ میں ؟ دارالعلوم کے علمی، عملی، تحقیقی اور تدریسی وتصنیفی ماحول میں آخر کس چیز کی کمی ہے ؟ پوچھنے والے جب پوچھتے تو جواب میں اپنے فقیہ محقق، عارف مدقق شیخ کامل کی صحبت مبارکہ میں چوبیس گھنٹے تک معرفت ومحبت خداوندی کی شراب سے سرشار ومخمور ہوکر آنے والے اس عالم ربانی کی زبان مبارک پر ہوتا ۔

لطف مئے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کمبخت ! تو نے پی ہی نہیں

یعنی تعلق مع اللہ، نسبت مع اللہ اور دل کا لذت آشنائے ذکر ہونا وغیرہ وہ امور کیفیہ ہیں جنہیں محسوس تو کیا جاسکتا ہے، ان سے لذت تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن انہیں بیان کیسے کیا جاسکتا ہے ۔ مٹھائیوں کے نام تو بتائے جاسکتے ہیں مگر مزہ نہیں بتایا جاسکتا ۔ یہ نعمت تو عملاً شریک ہونے اور مرشد کامل کی نگرانی میں راہ حق کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ہی حاصل ہوسکتی ہے ۔

اور یہ تو ہمارے اسلاف کرام کی باتیں ہیں، خود ہمارے زمانہ میں ایسے اہل اللہ ہوئے ہیں بلکہ موجود بھی ہیں جنہوں نے باوجود تمام ظاہری کمالات میسر ہونے کے بھی اپنے آپ کو مستقل بالذات اور فارغ الاصلاح نہیں سمجھا، بلکہ ہمیشہ اہل اللہ کی سرپرستی نگرانی ورہنمائی کے محتاج بنے رہے ۔ عارف باللہ حضرت قاری صدیق احمد صاحب مدظلہ العالی، استاذ الاساتذہ حضرت قاری امیر حسن صاحب دامت برکاتہم محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب مدظلہم وغیرہ جیسی ہستیاں آج بھی نمونۂ اسلاف اور یادگار اکابر بنی ہوئی ہمارے سامنے موجود ہیں ۔

۞ ان میں سے میں آپ کو حضرت ہردوئی دامت برکاتہم کی خدمت میں لے چلتا ہوں۔ آیئے ان کی زندگی پر نظر ڈالیں حضرت اس وقت بزم اشرف کے واحد چراغ ہیں۔ الحمدللہ سالکین راہِ طریقت کے مرکز نگاہ، اور بڑے بڑے علماء ومشائخ کے مرجع ومحبوب ہیں۔ ایک عالم ان کی رہنمائی وتربیت سے مستفید ہورہا ہے۔ آپ بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین تھے۔ صرف سات سال کی عمر میں حفظ قرآن کریم مکمل فرمالیا تھا۔ ۱۹ سال کی عمر میں درسیات ہی سے نہیں تخصصات سے بھی فراغت حاصل کرلی تھی۔ اور امتیازی درجات سے کامیاب ہوئے تھے۔ علمی صلاحیت میں پختگی اور عملی واخلاقی طور پر صالحیت میں عمدگی سے متأثر ہوکر خود ان کے اساتذہ نے مدرسہ مظاہر العلوم میں معین مدرس رکھ لیا تھا۔ خاندانی اعتبار سے نہایت ہی متمول و مالدار ہونے کے ساتھ حسن وجمال بھی اعلیٰ درجہ کا مقدر سے میسر تھا۔ اس سب کے باوجود کھڑی جوانی میں ہی وہ اپنے والد بزرگوار کی صحیح تربیت کی برکت سے مجاہد ومرتاض تہجد گذار وشب زندہ دار اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے عاشق زار تھے۔ ہر جمعہ کی تعطیل تھانہ بھون ہی میں گذارتے تھے۔ عید بقرعید کی تعطیلات کا بھی اکثر حصہ انہیں کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اسی مسلسل فکر وکاوش کا نتیجہ یہ تھا کہ ۲۲ سال کی عمر میں جب آدمی اکثر ٹپ ٹاپ اور تقاضہائے شباب کی تکمیل میں مشغول رہتا ہے توفیق الٰہی سے تصوف وسلوک کے تربیتی مراحل سے گذر کر اپنے شیخ حکیم الامتؒ جیسے باریک بین ونکتہ رس مربی کی نظر میں اصلاح وتربیت، بیعت و تلقین کی اجازت کے لائق ہوچکے تھے اور خلافت کے اہل قرار پاگئے تھے۔ لیکن انہوں نے بزرگوں کا جو بھی ماحول دیکھا تھا اور خانقاہ تھانہ بھون کی وابستگی میں جو فکری تربیت پائی تھی اس کی روشنی میں کبھی اپنے کو ''مستقل بالذات'' اور کاملین کی صحبت وسرپرستی کی ضرورت سے مستغنی نہیں سمجھا۔ چنانچہ جب حضرت حکیم الامت کا وصال ہوگیا تو حضرت خواجہ صاحبؒ سے وابستہ ہوگئے ان کا بھی انتقال ہوگیا تو حضرت مصلح الامۃ کو سرپرست بنالیا، وہ بھی دنیا میں نہ رہے تو حضرت پھولپوریؒ سے سلسلۂ تعلق جوڑ لیا۔ وہ بھی وفات پاگئے تو سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک متبع سنت وصاحب علم بزرگ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی دامت برکاتہم کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضری دینے اور ان سے جڑے رہنے کا اہتمام آج بھی فرمارہے ہیں[1]۔

دھیان دینے اور توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ عالم دین، حافظ قرآن، شیخ طریقت بلکہ شیخ المشائخ، بلا مبالغہ ہزاروں علماء اور لاکھوں مسلمانوں کے محبوب ومخدوم روحانی رہنما ہونے کے باوجود اور خلقِ خدا کی

---

[1] افسوس کہ اس مضمون کی اشاعت کے وقت دونوں ہی بزرگوں کے وجود مسعود سے دنیا محروم ہوچکی ہے۔ اللھم لاتحرمنا اجرھم ولا تفتنا بعدھم۔ آمین

زبان سے ''عارف باللہ''، ''محی السنہ'' جیسے القاب وآداب سے یاد کئے جانے کے باوصف، سینکڑوں مدارس دینہ کے ناظم اور بیسیوں دینی جماعتوں کے سرپرست وسربراہ ہونے کے بعد بھی کیوں انہیں اپنے آپ پر اعتماد کی جرأت نہیں ہوتی اور کیوں کسی نہ کسی بڑے سے وابستہ اور زیر سایہ رہنے کو لازمی وضروری سمجھتے ہیں؟ اس کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے جو ان ہی کے شیخ حکیم الامتؒ نے زندگی بھر کے تجربہ کے بعد فرمایا تھا:

''وصول الی اللہ اور نسبت مع اللہ کا حصول (پھر اس کا بقاء بھی) صحبت کاملین کے بغیر عادۃً ممکن نہیں ہے''۔

۞ ان ہی کے ایک خلیفۂ اجل عارف باللہ حضرت حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم کا حال دیکھئے کہ پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان کے بشمول اس وقت دنیا کے تقریباً ۳۲ سے زائد ملکوں میں مریدین و متوسلین کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ عرب ممالک تک میں اہل سلسلہ موجود ہیں گویا کہ اس وقت کے شیخ العرب و العجم بنے ہوئے ہیں۔ مقبولیت ومحبوبیت کا یہ عالم ہے کہ کسی شہنشاہ کو کیا نصیب ہو۔ حکیم جسمانی بھی، طبیب روحانی بھی، مثنوی مولانا رومؒ کے شارح بھی ہیں، شیخ پھولپوری کے معارف وعلوم کے وارث بھی۔۔۔ کتنے نوجوان ہیں جو بے دینی وگمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے ان کی رہنمائی میں راہِ ہدایت کے شہسوار بن گئے اور کتنے ہی علماء و مدرسین جو ملائے خشک و ناہموار تھے، ان کی فیض صحبت سے خدا رسیدہ وبرگزیدہ ہوگئے۔ بایں ہمہ مراتب کمالات یہ سنی سنائی بات نہیں آنکھوں سے دیکھا حال ہے کہ جب ہردوئی تشریف لائے اور ان کے شیخ حضرت محی السنہ مدظلہم نے ان سے نماز مغرب پڑھوانے کے بعد فرمایا ''تجوید کی پختگی میں ایک آنچ کی کسر ہے'' تو یہ منظر میں بھول نہیں سکتا کہ بعد فجر تقریباً ایک گھنٹہ تک ہندوستان کے نامی گرامی بزرگوں اور بڑے بڑے علماء کی موجودگی میں علوم ومعارف کی بارش برسانے کے بعد حضرت حکیم صاحب مدظلہ ''نورانی قاعدہ'' ہاتھ میں لئے درجۂ قاعدہ کے طلبہ کے ساتھ ترانہ میں موجود نظر آتے تھے۔ اور یہ نقشہ بھی آنکھوں میں گھوم رہا ہے کہ ایک رات مہمان خانہ میں ان کے اعزاز میں ایک نورانی مجلس جمی تھی جس میں مخدوم الاکابر حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھیؒ میر مجلس تھے، ایک طرف حضرت محی السنہ مدظلہ کی نشست تھی ایک جانب حضرت حکیم صاحب مدظلہ کی۔ سامنے حضرت حکیم صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لانے والے مختلف علاقوں کے علماء کرام اور دیگر حاضرین وسامعین۔ سخت سرما کا موسم تھا اس لئے درمیان میں ایک انگیٹھی بھی دہکا کر رکھی ہوئی تھی۔ کبھی حضرت ہردوئی ارشاد فرمارہے ہیں اور کبھی حضرت حکیم صاحب بیان فرمارہے ہیں۔ درمیان میں کسی مناسبت سے حضرت پرتاب گڑھی اپنے اشعار

سنا رہے ہیں ۔کبھی کامل چائیس پوری سے فرمائش ہورہی ہے کہ وہ کوئی نظم سنائیں عجیب حسین منظر تھا وہ، خیر! عرض یہ کررہا ہوں کہ شب جس کے اعزاز واکرام میں یہ محفل سجائی گئی تھی صبح وہی حکیم صاحب مدظلہ ایک عریضہ پیش کرنے کے لئے حضرت ہردوئی کی نشست گاہ میں تشریف لائے جیسے ہی اندر داخل ہوئے اپنی آنکھوں نے یہ نقشہ خود دیکھا اور سینہ نے محفوظ کیا ہے کہ عالی مرتبت شیخ اپنے اس مرید باصفا پر خفا ہورہے ہیں اور فرمارہے ہیں:

''آپ کو اندر آنے کے آداب نہیں معلوم؟ آپ نے اجازت لی؟ باہر تختی آویزاں ہے اس کو پڑھ لیتے! کچھ نہیں بس ہر آدمی اپنے آپ کو مستثنیٰ اور مقرب سمجھ لیتا ہے اب جایئے بعد میں پھر طریقہ سے آکر دیجئے''۔ اللہ اکبر!

خون دل پینے کو لخت جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناں، تیرے دیوانے کو

حضرت حکیم صاحب واپس آگئے کچھ دیر کے بعد دروازہ کے باہر کھڑے ہوکر دبی زبان میں سراپا ادب ہوکر عرض کیا ''اختر حاضر ہوسکتا ہے؟'' اجازت ملی اور خط دیکر چلے گئے اس دروگیر پر نہ ماتھے پر شکن آئی اور نہ ہی طبیعت پر گرانی کے اثرات ہوئے۔ بلکہ دن میں کسی وقت دیکھا کہ مولانا بشارت علی صاحب اور چند خواص کے ساتھ دفتر میں بیٹھ کر عظمت ومحبت کے ملے جلے جذبات میں خود ہی اس واقعہ کو مزے لے لے کر سنا رہے تھے اور بزبانِ حال فرمارہے تھے۔

نہیں کوئی خواہش ترے در پہ میں لایا ہوں
مٹا دیجئے، مٹا دیجئے میں مٹنے ہی کو آیا ہوں

ادھر عصر کے بعد کی مجلس میں حضرت محی السنہ مدظلہ نے اصلاح نفس اور تربیت اخلاق کی جانب تو توجہ دلاتے ہوئے حضرت حکیم صاحب ہی کی مثال دی اور فرمایا دیکھتے نہیں ہو حکیم صاحب خود بڑے عالم ہیں اور شیخ بھی ہیں ان سے ملاقات کیلئے حضرت مولانا علی میاں اور حضرت مفتی محمود حسن صاحب جیسے اکابر تشریف لارہے ہیں۔ اور کس طرح وہ قرآن مجید کی تصحیح کے لئے اور اللہ کے کلام کو سنت کے مطابق پڑھنے سیکھنے کے لئے درجہ قاعدہ کے طلبہ میں بیٹھ کر مشق کررہے ہیں فکر پیدا ہوتی ہے تو سب کچھ آسان ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے درد بھری آواز میں با چشم نم حضرت حکیم صاحب کی شان میں یہ شعر پڑھا تھا۔

ایں چنیں شیخے گدائے کو بکو عشق آمد لا ابالی فاتقوا

اس کے بعد بھی مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ کسی بات پر حضرت ہردوئی نے حضرت حکیم صاحب سے فرمایا کہ آپ اپنے علاج کے لئے تدریس، تالیف، تبلیغ سب بند کردیں اور اپنی فکر میں لگ جائیں، تو سراپا اطاعت ہوکر کمال تفویض وتسلیم کا مظاہرہ فرمایا۔ پھر جب حضرت حج کے لئے براہ کراچی تشریف لے جارہے تھے تو کراچی ایر پورٹ پر ان سے ملاقات ہوئی۔ اپنے سینے سے لگا کر تمام خدمتیں بحال فرمادیں اور حکیم صاحب نے بطور تشکر اپنے یہ اشعار شیخ کی خدمت میں پیش فرمائے ؎

مری رسوائیوں پر آسماں رویا زمیں روئی میری ذلتوں کا لیکن آپ نے نقشہ بدل ڈالا
بہت مشکل تھا مرے امارہ کا چت ہونا تری تدبیر الہامی نے اس کا سر کچل ڈالا

سبحان اللہ! کیا حالات ومقامات ہیں یہ!

دوستو! ہمیں اس کی ہوا بھی نہیں لگی، یہ کوئی دل لگی نہیں ہے، کھیل تماشا نہیں ہے، ڈرامے نہیں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان مواقع پر ''نفس کشی'' کے ان کٹھن مرحلوں سے گذرنے سے زیادہ آسان جان دینا نظر آتا ہے۔ مگر ان حضرات کا یقین کامل بن گیا تھا۔ ؎

کمال عشق تو مرمر کے جینا ہے، نہ مرجانا

غرض یہ ہے کہ اس وقت جب کہ تعلیم کا رسمی سلسلہ اختتام پذیر ہورہا ہے اور آپ محدث عظیم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ کے ہاتھوں دارالعلوم کے ''السابقون الاولون'' بنتے ہوئے دستار فضیلت حاصل کرنے جارہے ہیں۔ اس بات کا تہیہ وارادہ بھی کرلیجئے کہ اپنی مناسبت کا خیال رکھتے ہوئے مشائخ کرام میں سے کسی نہ کسی سے اپنا رشتۂ ارادت واطاعت جوڑ لیں گے اور اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک کہ تکمیل سلوک یعنی حصول اللہ کی نعمت عظمیٰ حاصل نہ ہوجائے گی۔

نہ جانے کیا سے کیا ہوجائے میں کچھ کہہ نہیں سکتا
جو دستار فضیلت گم ہو دستار محبت میں

آخر میں دراز گوئی وطویل کلامی نیز جرأت و بے باکی کی سب ساتھیوں سے معذرت خواہی کو ضروری سمجھتا ہوں کہ بے تکلفی وتعلق باہمی میں یہ سب کچھ کہہ گذرا۔ نہ میں اس کا اہل ہوں نہ ہی ان خوبیوں کا حامل۔ عرض کی گئیں سب باتوں کو عمل میں لانے کا آپ سب سے زیادہ میں ہی محتاج ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل نصیب فرمائیں۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

مولانا محمد مجاہد ندوی ۞

مسلمانوں کا نظام تعلیم

کسی بھی قوم کا نظام تعلیم وتربیت اور نصاب تعلیم اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ اگلی نسلوں تک قومی ورثہ کی منتقلی اور نئی نسل کی اس اعتبار سے ذہنی تشکیل وتربیت کہ وہ قوم کے مفاد میں کام کریں نصاب تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ نصاب تعلیم قوم کے عقائد وتصورات اور افکار ونظریات کے فروغ اور اس کے تحفظ کا اہم ذریعہ ہے۔ پھر جب معاملہ ایسی قوم کا ہو جس کے اعتقادات، افکار ونظریات اپنے بنائے ہوئے نہ ہوں بلکہ وحی الٰہی پر استوار ہوں اور جس کا فکری ڈھانچہ علم نبوت اور علم ازلی پر تیار ہوا ہو، ایسی قوم اس بات کی زیادہ ذمہ دار ہے کہ وہ ایسا مؤثر نظام تعلیم وتربیت اور ایسا جامع نصاب تعلیم تیار کریں جو قوم کی آئندہ نسلوں کے ایمان وعقیدے کے تحفظ، ان کے خیالات ورجحانات کو قوم کے خیالات ورجحانات سے ہم آہنگ کرنے اور ان میں قوم کی سربلندی کے لئے اپنی زندگیاں صرف کرنے کے جذبہ کو پروان چڑھانے میں معاون ہو۔

ہمارا تعلیمی نظام ونصاب کیسا ہونا چاہئے، اس کے لئے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت کا کیا طریقہ کار تھا، اس لئے کہ وہی ہمارے لئے اسوۂ حسنہ اور قابل تقلید نمونہ ہے۔ امام دارالہجرہ مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ اس امت کے آخری لوگوں کی اصلاح اسی طریقہ اور راستہ سے ممکن ہے جن سے اس امت کے اوّل لوگوں کی اصلاح ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ہم اپنے مقصد میں اسی وقت کامیاب ہوسکتے ہیں جب ہم اپنے تمام امور میں طریقہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جمہور امت کی پیروی کریں گے۔

لہذا ہمیں اپنے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کو با مقصد، کامیاب اور مؤثر بنانے کے لئے عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے دور عروج کے نصاب ونظام تعلیم کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے تاکہ تعلیم کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بنیادیں فراہم کی ہے ان خطوط پر ہم اپنے تعلیمی نظام کو استوار کرسکیں۔ ذیل میں ہم مندرجہ ذیل عناوین کے تحت مسلمانوں کے نظام ونصاب تعلیم کا جائزہ لیں گے۔

۞ صدر اسلامک اسٹڈیز، ارقم پبلک اسکول، ناگپور

۱۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تعلیم کا نظام ونصاب
۲۔ عہد وسطی میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت
۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت
۴۔ موجودہ نظام تعلیم: ذمہ داری اور تقاضے

مندرجہ بالا عناوین کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور دور عروج میں مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت اور نصاب تعلیم کا جائزہ ہمارے لئے دو وجوہات کی بنا پر نہایت مفید اور ناگزیر ہے۔

۱۔ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام تعلیم تربیت اور نصاب تعلیم کا تو اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے تعلیم کے سلسلے میں ایسی بنیادیں فراہم کی تھیں جس کی بنا پر آگے چل کر مسلمانوں نے علمی ترقیاں کیں، مختلف علوم وفنون کو پروان چڑھایا اور ان کی سرپرستی کی، تہذیب وتمدن کی داغ بیل ڈالیں، اور جس کے باعث وہ ساری دنیا کے معلم قرار پائے، اس کی اساس ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کردہ بنیاد ہی پر تھی۔

۲۔ مسلمانوں کے دور عروج کے نظام تعلیم تربیت اور نصاب تعلیم کا جائزہ لینا اس لئے ضروری ہے، تاکہ ہم جان سکیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور مسلمانوں کے ماہرین تعلیم نے دین اسلام کے اصل مزاج ومنشاء اور شریعت اسلامی کی اصل روح ومقصد کو برقرار رکھتے ہوئے زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں کونسا انداز اختیار کیا، نیز ہر دور میں ایسا جامع نظام ونصاب تعلیم (جو مسلمانوں کی دینی ودنیوی ضروریات کی تکمیل کرے اور ان کو غیر مسلموں کا محتاج نہ بننے دے) ترتیب دینے کے لئے کیا طریقۂ کار اپنایا، اور اس سلسلہ میں توازن واعتدال کے لئے کن بنیادی چیزوں کا لحاظ رکھا۔

اس سے قبل کہ ہم مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت اور نصاب تعلیم سے متعلق گفتگو کریں، دو باتوں کا جان لینا مناسب معلوم ہوتا ہے ایک یہ کہ اسلامی اعتبار سے تعلیم کا مقصد کیا ہے اور اس کی طلب میں کیا نیت کارفرما ہونی چاہئے۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اور مسلمانوں کے دور عروج میں تعلیم کا ایک ہی نظام رائج تھا یا موجودہ دور کی طرح اس میں بھی ثنویت پائی جاتی تھی۔

تعلیم کا مقصد

تعلیم کا مقصد کیا ہے، بچوں کو تعلیم کیوں دی جائے اور اسلامی نقطہ نظر سے علم کی طلب میں کیا نیتیں کارفرما ہوں۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایک مشہور برطانوی ماہر تعلیم (Thomas)

Percy Nunn کا قول نقل کیا ہے اور فرمایا کہ میں نے تعلیم کی تعریف کے سلسلہ میں جو کوششیں دیکھی ہیں، اور جو عبارتیں میری نظر سے گزری ہیں میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ جامع اور عملی تعریف ہے۔(۱)

وہ مشہور برطانوی ماہر تعلیم لکھتے ہیں:

تعلیم کا بنیادی خیال جو پورے نظام تعلیم پر حاوی ہونا چاہئے یہ ہے کہ تعلیم اس کوشش کا نام ہے جو بچوں کے والدین اور سرپرست اس نظریۂ حیات پر (جس پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں) اپنی نئی نسل کو تیار کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ تعلیمی ادارے کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی طاقتوں کو جو اس نظریۂ حیات سے وابستہ ہیں طالب علم پر اثر ڈالنے کا موقع دے اور وہ طالب علم کو ایسی تربیت دے جو اس قوم کی زندگی کے تسلسل و ترقی میں طالب علم کی دستگیری کرے اور اس کے ذریعہ وہ مستقبل کی طرف اپنا سفر جاری رکھ سکے۔(۲)

تعلیم کا یہی مقصد ہونا چاہئے کہ ہماری آئندہ نسلوں کا اعتماد اسلامی تعلیمات، عقائد و نظریات اور اقدار پر بحال ہو، یہ نظام تعلیم ان اقدار پر، ان حقائق پر اور ان معتقدات پر ایمان راسخ کرے جن پر دین اسلام کی عمارت قائم ہے۔ اور آنے والی نسلوں کی ان خطوط پر ذہنی تشکیل کا فریضہ انجام دے کہ وہ ملت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے میں فخر محسوس کریں، وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اسلام کی سربلندی اور اس کے فروغ میں صرف کردیں، وہ ایک صالح انسان، شریف شہری اور اسلام کے سپاہی بنیں، یہ نظام تعلیم خلافت ارضی کا جو منصب اللہ نے امت کو تفویض فرمایا ہے اس کی بجا آوری کا احساس اور استعداد ان میں پیدا کرے، یہ ہیں تعلیم کے وہ اعلیٰ مقاصد جو مسلمانوں کے سارے نظام تعلیم میں کارفرما ہونا چاہئے۔

نظام تعلیم کی ثنویت اور اسلام

مسلمانوں میں دینی و دنیوی تعلیم کے الگ الگ ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے، مسلمانوں کے دور عروج میں کبھی بھی دو نظام تعلیم نہیں رہے، اسلام میں دینی مدارس و غیر دینی مدارس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ مغربی استعمار کے باقیات و اثرات میں سے ہے۔ مسلمانوں کے دور عروج میں مسلمانوں کا نظام تعلیم ان کی دین و دنیا دونوں کی ضرورت پوری کرتا تھا، چنانچہ ایک ہی مدرسہ کے فارغین میں ماہر علماء بھی ہوتے تھے اور دوسرے تمام شعبوں کے ماہرین بھی۔ علماء کرام مسلمانوں کی مساجد میں امامت و خطابت اور دینی مسائل میں ان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے، جبکہ زندگی کے دوسرے شعبوں کے ماہرین اپنے اپنے شعبوں میں اپنی خدمات انجام دیتے تھے۔ اس طرح سے ایک ہی تعلیمی نظام و نصاب کے ذریعے مسلمانوں کی دینی

و دنیوی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں بھی تعلیم کا یہی طریقہ رائج تھا۔ چنانچہ مغلیہ دور میں جس درس گاہ نے، جس نظام تعلیم اور نصاب تعلیم نے مجدد الف ثانی جیسا شخص پیدا کیا، جس کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا: مسلم ہندوستان نے سب سے بڑا جو مذہبی عبقری پیدا کیا، وہ شیخ احمد سرہندی تھے۔

''اسی نظام میں نواب سعد اللہ خان بھی تیار ہوا تھا جو مجدد صاحب کا کلاس فیلو تھا اور جو سلطنت مغلیہ کا وزیر اعظم بنا۔ وہ سلطنت مغلیہ جو موجودہ افغانستان، پاکستان، ہندوستان، نیپال، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھوٹان، سکم، برما، ان سب ریاستوں پر مشتمل تھی۔ اس کے نظام کو اس نے شاہ جہاں کے زمانے میں کامیابی سے چلایا تھا۔ پھر سید احمد معمار جس نے تاج محل بنایا، یہ بھی مجدد صاحب کا کلاس فیلو تھا۔ یہ تینوں ایک ہی استاذ کے شاگرد تھے اور ایک ہی درس گاہ کے پڑھے ہوئے تھے۔ اب دیکھئے کہ ایک وہ شخص جس نے دنیا کی متمدن ترین سلطنت کو اس کے کامیاب ترین ادوار میں قیادت فراہم کی اور اس کا نظام چلا کر دکھایا، دوسرا وہ شخص جو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا عبقری ہے، جس کی عظمت کو بیان کرنا دشوار ہے اور جس نے برصغیر کی دینی تحریکات پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ بعد کی کوئی دینی تحریک اور کوئی دینی سرگرمی اس کے اثر اور شخصیت کے احترام سے خالی نہیں ہے، اور تیسرا وہ شخص جس نے دنیا کے سات عجائب میں سے ایک عجوبہ بنایا، یہ تینوں افراد ایک ہی نصاب کے پڑھے ہوئے اور ایک ہی تعلیمی نظام کی پیداوار تھے۔ یہی اسلام کا آئیڈیل اور یہی اسلام کا معیار ہے۔(۳)''

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' کے حصہ دوّم میں لکھتے ہیں:

''اس وقت جن تجویزوں کو اپنے دماغ میں رکھتا ہوں اور تفصیلی ذکر جن کا اپنی کتاب ''مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' (حصہ اوّل) میں، میں نے کیا ہے ان کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام (حکومت مسلطہ) کے قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں ان کی دوئی و ثنویت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کر لیا جائے۔ اسی لئے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے ''نظریۂ وحدت تعلیم'' رکھا ہے۔(۴)''

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تعلیم کا نظام و نصاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ رب العزت نے ساری انسانیت کے لئے نبی اور نجات دہندہ بنا کر بھیجا تھا،

گویا ساری انسانیت کی راہ حق کی طرف رہنمائی اوران کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری آپ ﷺ کے کاندھے پر ڈالی گئی، رسول اللہ ﷺ نے اخلاص وللّٰہیت اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا، آپ ﷺ نے زندگی کے ہر شعبہ کو تمام مضر اور خدا بیزار چیزوں سے پاک کیا اور انہیں مفید و کارآمد بنایا۔ اس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبے میں خوشگوار تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ لوگ عین فطرت کے مطابق اس سے متمتع ہونے لگے۔ ظاہر ہے آپ نے جو کام بھی کیا اس میں اللہ رب العزت کی منشاء اور رہنمائی بھی شامل تھی۔

اسی طرح تعلیم وتربیت کے شعبہ میں بھی آپ نے غیر معمولی توجہ فرمائی، اور امت کے لئے ایک جامع، مؤثر اور مفید نظام ونصاب تعلیم مرتب فرمایا جو خالق کی معرفت کا ذریعہ، انسان کی اخلاقی و دینی تربیت اور مالک حقیقی کی منشاء کے مطابق دنیوی زندگی سے متمتع ہونے میں ممد ومعاون، ساری انسانیت بالخصوص امت مسلمہ کی دینی و دنیوی ترقی کا ضامن اور ہر طرح کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کے نزدیک تعلیم کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ غزوہ بدر کے قیدیوں کو آپ نے بطور فدیہ مسلمان بچوں کی تعلیم پر مامور کیا۔ (حالانکہ اس وقت مسلمانوں کو مال کی نہایت ضرورت تھی اور قیدیوں سے بھاری مال وصول کیا جاسکتا تھا)۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو نہ صرف یہ کہ مذہبی تعلیم سے بہرہ یاب فرمایا بلکہ اس وقت کے ہر مروّجہ اور نفع بخش علوم کی حوصلہ افزائی کی، اور اسکے حصول کی صرف ترغیب ہی نہیں دی بلکہ اس سلسلہ میں جا بجا اقدامات کئے اور اس کا بہترین نظم ونسق فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کا کیسا نظام قائم کیا اور اس میں کیا نصاب تعلیم رائج تھا۔ یہاں ان تمام کا احاطہ مشکل ہے۔ سردست چند اہم مضامین کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

آپ نے مسجد کے ایک گوشہ کو ''صفہ'' علم وادب کا مرکز قرار دیا۔ جسے موجودہ زبان میں ''رہائشی یونیورسٹی'' (دارالتعلیم والتربیہ) کہا جاسکتا ہے۔ (۵) اگرچہ اس پہلی ''اسلامی یونیورسٹی'' میں تعلیم ابتدائی نوعیت کی تھی، اس کے باوجود متعدد شعبوں پر مشتمل تھی۔ مثلاً لکھائی پڑھائی کا شعبہ، تعلیم قرآنی کا شعبہ، جو لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے، انہیں اس وقت تک کی نازل شدہ آیات قرانی کی تعلیم دی جاتی، فقہی احکام و مسائل کا شعبہ ہر ایک شعبہ میں ماہر وتجربہ کار اساتذہ کام کرتے تھے۔ (۶) رسول اللہ ﷺ مختلف علوم سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں، چنانچہ آپ نے بہت سے علوم وفنون کا حکم دے رکھا تھا، جیسے زبانوں کی تعلیم، علم ہیت، علم الفرائض، پیراکی، نشانہ بازی، تیغ زنی، فن کتابت وغیرہ۔

عہد نبوی ﷺ میں خاص طور پر علم طب کی کافی اہمیت سمجھی جاتی تھی، ایک حدیث میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی بیمار ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تمھارے محلے یا قبیلے میں کوئی طبیب ہے؟ جواب میں دو نام بتائے جاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ان میں سے جو ماہر تر ہو اسے بلاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ علم میں تخصص (Specialization) پیدا کریں اور ماہروں سے علاج کرائیں، نیز اس سے لوگوں کو ماہر بننے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ دوسرا علم جس کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی تفصیل سے ہے، وہ علم ہئیت ہے۔ اس کے فوائد خود قرآن میں بتائے گئے ہیں۔ اس علم کے ذریعے رات کے وقت مسافر اپنا راستہ معلوم کرسکتا ہے۔ اس کے ذریعے سے اوقات کا اور حج کے زمانے کا تعین ہوگا۔ علم ہئیت کی طرف بڑی توجہ کی جاتی تھی اور خود رسول اللہ ﷺ کو اس سے بڑی واقفیت تھی۔ (۷) اسی طرح آپ نے فرمایا۔ انساب کا علم حاصل کرو، تاکہ تمہارے درمیان محبت بڑھے۔ (۸) اور فرمایا: ''**تعلموا الرمی والقرآن**'' (۹) تیراندازی سیکھو اور قرآن کی تعلیم حاصل کرو۔ اسی طرح دیگر علوم کے ساتھ تحریر و کتابت اور املا بھی نصاب میں شامل تھا۔

اسلام چونکہ ایک عالمی دین ہے۔ اس کے احکام و تعلیمات کو دنیا کے ہر خطہ میں قائم کرنا امت کی ذمہ داری ہے۔ اس مقصد کے لئے مختلف علاقوں کے لوگوں سے ربط و تعلق ان کی ضروریات کو معلوم کرنے نیز دعوتی مقاصد کے پیش نظر زبان کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، لہذا آپ نے دینی اغراض و مقاصد کے پیش نظر دوسری قوموں کی زبان سیکھنے کی ترغیب بھی دی۔ آپ نے یہودیوں سے خط و کتابت کے سلسلہ میں حضرت زید بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا۔ (۱۰)

درجہ تخصص اور یک فنی (کسی ایک فن میں مہارت) بھی عہد نبوی میں ترقی کر گیا تھا اور حضور اقدس ﷺ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے: جسے قرآنی علوم و معارف حاصل کرنے ہوں وہ چار حضرات کی خدمت میں حاضری دے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت سالم مولیٰ ابوحذیفہ رضی اللہ عنھم۔ (۱۱) اسی طرح ایک دوسرے موقع پر فرمایا: علم میراث کے ماہر زید بن ثابت ہیں، تجوید و قرأت کے ماہر ابی بن کعب اور حلال و حرام کے احکام کے ماہر معاذ بن جبل ہیں۔ (۱۲) سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی متعدد زبانوں کے ماہر تھے اور ان میں نہایت آسانی کے ساتھ گفتگو کرسکتے تھے۔ (۱۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم کا جو نظام قائم فرمایا تھا اس کی اساس قرآن مجید پر تھی اور اس نظام تعلیم کی علمی زبان عربی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تعلیمی نظام کی اساس قرآن کریم پر کیوں رکھی، اس کی بظاہر دو اہم وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ کتاب الٰہی ہے اور یہ کتاب محض انسانوں کے لئے نازل کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو تعلیم کی اساس بنایا گیا، تاکہ ہر انسان اس کو اپنی ذاتی کتاب سمجھے، اس کی تلاوت کا اہتمام کرے، اسے حرز جاں بنائے اور زندگی کے ہر شعبے میں اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ نیز اس کتاب کے ذریعہ انسان اپنے خالق کی صحیح معرفت حاصل کرے، اپنے دنیا میں آنے کے مقصد کو پہچانے، شرک و بت پرستی اور اخلاق رذیلہ کو ترک کرے، نفس کی تہذیب و تزکیہ اور اخلاق فاضلہ کے زیور سے اپنے ظاہر و باطن کو آراستہ کرے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف دین و عقائد، عبادات اور متعلقہ اخلاقی چیزوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں بہ کثرت دیگر علوم بھی نظر آتے ہیں۔ اس میں تاریخ کا بھی ذکر ہے۔ اس میں ان علوم کا بھی ذکر ملتا ہے جنہیں ہم سائنس کا نام دیتے ہیں۔ مثلاً علم نباتات، علم حیوانات، علم حجر، علم بحر، علم ہیئت یہاں تک کہ علم جنین کا بھی ذکر ملتا ہے۔ قرآن شریف میں علم جنین کی اتنی مفصل تشریحات آئی ہیں کہ ان کا جدید ترین دور تک بھی اثر ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کریم پر اپنے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی اور فیصلہ کیا گیا کہ قرآن کو پڑھو، کیوں کہ اس میں تقریباً تمام علوم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح عربی زبان کو نظام تعلیم کی علمی زبان کے طور پر انتخاب کیا گیا کہ یہ قرآن کی زبان ہے جس پر تعلیم کی اساس ہے۔ اور بھی دیگر وجوہات ہیں جس کی بنا پر اس کو علمی زبان قرار دیا گیا۔

عہد وسطی میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم و ثقافت کی جو بنیادیں فراہم کی تھیں، اور جو نظام تعلیم وضع فرمایا تھا۔ بعد کے مسلمانوں نے اس کو اسی نہج پر آگے بڑھایا اور اس پر ایسی بے مثال عمارت کھڑی کی جن پر علمی دنیا کو بجا طور پر فخر ہے۔

مسلمان علماء، دانشور اور ماہرین تعلیم نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا اس کی اساس بھی انہوں نے قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہی رکھی، ان کے نظام تعلیم میں علوم و فنون کی اساس قرآن مجید تھا، قرآن مجید وہ

جڑ فراہم کرتا تھا جس سے علوم وفنون کا گلشن پیدا ہوا، یہی وہ درخت تھا جس کے برگ و بار اور ثمرات مسلمانوں کے بقیہ علوم وفنون کی صورت میں سامنے آئے۔ آج سے کم وبیش ایک ہزار سال پہلے قاضی ابوبکر بن العربی نے، جو مشہور مفسر اور مالکی فقیہ ہیں، کہیں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے جملہ علوم وفنون کی تعداد سات سو ہے۔ ان سات سو علوم وفنون کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ سنت سے ہیں اور یہ سب سنت کی شرح ہیں، اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کی تشریح وتفسیر ہے۔ اس لئے قرآن مجید کی حیثیت اس بنیاد اور جڑ کی ہے جس پر مسلمانوں کی ساری تعلیمی، فکری اور تہذیبی سرگرمی کا دارومدار ہے (۱۴) انہوں نے علوم وفنون کے سلسلہ میں قرآن کریم ہی سے رہنمائی اخذ کی اور اسی کو بنیاد بنا کر دیگر علوم سے اعتناء کیا، انہوں نے مختلف علوم کو پروان چڑھانے میں قرآن سے کس طرح مدد لی اس کو ایک مثال سے سمجھئے!

قرآن نے یہ بتایا کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ انسانوں کے فائدہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ {**و سخر لکم مافی السماوات و مافی الارض جمیعا منه، ان فی لآیات لقوم یتفکرون**} (۱۵) (اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اس سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو غور وفکر سے کام لیں۔) زمین، آسمان، چاند، سورج، پانی، ہوا، جانور، اجرام فلکی، جمادات، نباتات، ستارے، سیارے، سمندر، اور زمین وآسمان کے درمیان جو کچھ بھی ہیں، یہ تمام چیزیں انسان کے فائدے کے لئے اور اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئیں ہیں۔ جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہے اور ان کو ہر طرح استعمال کیا جاسکتا ہے، تو پھر انہوں نے ان تمام چیزوں پر تحقیق کا عمل شروع کیا، علم وتحقیق کی بناڈالیں، رصد گاہیں اور تجربہ گاہیں قائم کیں اور سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں نمایاں تحقیقات پیش کیں۔

مغربی ماہر تعلیم اور مؤرخین نے بھی علوم وفنون پر قرآن کے اس احسان کا ذکر کیا ہے۔ ایک یہودی مستشرق (Hartwig hirschfeld) لکھتے ہیں:

''ہم کو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ قرآن علوم کا سرچشمہ ہے، آسمان، زمین، انسانی زندگی، تجارت وحرفت جن کا اس میں ذکر کیا گیا ہے، ان پر متعدد کتابوں یا تفسیروں میں روشنی ڈالی گئی، اور ان پر بحث ومباحثہ کا دروازہ کھلا، اور مسلمانوں میں بالواسطہ مختلف علوم کی ترقی کا راستہ ہموار ہوا، روحانیت کے میدان میں اسلام کی کوشش مذہبیات تک محدود نہیں رہی، یونانی فلکیات اور طبی تحریروں سے واقفیت نے ان علوم کی طرف متوجہ کیا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو جو وحی ملی، اس میں اجسام فلکیہ کے گردش کرنے کا

ذکر ان کی عبادت کے لئے نہیں، بلکہ اللہ کی نشانی اور انسان کی خدمت کے طور پر کیا گیا ہے، تمام مسلم اقوام نے فلکیات کا بڑی کامیابی کے ساتھ مطالعہ کیا، صدیوں تک وہی اس علم کے حامل رہے، اور آج بھی اکثر ستاروں کے عربی نام اور متعلقہ الفاظ مستعمل ہیں، یورپ میں عہد وسطی کے ماہرین فلکیات عربوں کے شاگرد تھے، اسی طرح قرآن نے طبی علوم کی تحصیل کی ہمت افزائی کی، اور عمومی طور پر فطرت کے مطالعہ اور غور وفکر کی جانب توجہ مبذول کی۔(۱۶)

ایک ایسے نظام تعلیم نے جس کی اساس قرآن مجید، سنت رسول اور ان دونوں سے پیدا ہونے والے علوم وفنون پر تھی، مسلمانوں کے خالص دینی تقاضے بھی پورے کئے اور خالص دنیوی تقاضے بھی۔ان میں بڑی بڑی ریاستیں بھی قائم ہوئیں، بڑے بڑے شہر اور ملک فتح ہوئے، نئی تہذیب وتمدن کی بنیاد پڑی ان سب کے نظم ونسق کے لئے ماہر افراد بھی اسی نظام تعلیم سے مہیا کئے گئے۔

مسلمانوں نے جو نظام تعلیم قائم کیا تھا وہ کبھی بھی جمود وتعطل کا شکار نہیں ہوا، اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے دین کے اصل مزاج ومقصد کو باقی رکھتے ہوئے زمانہ کے تغیرات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ رکھا، انہوں نے اپنے تعلیمی نصاب میں زمانہ کے مروجہ علوم کو جگہ دی، اور اسے اپنے زمانے کا سب سے زیادہ مؤثر اور زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ (Up to date) تعلیمی نظام ونصاب کے طور پر باقی رکھا، انہوں نے اپنے یہاں پڑھنے والے طلبہ میں قرآن وسنت اور تمام مروجہ علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ، فن سپہ گری، تیغ زنی، تیراندازی، تیراکی اور گھڑسواری میں مہارت پیدا کرنے پر خصوصی توجہ مبذول کی۔جس طرح انہوں نے نہج نبوت کی پیروی میں قرآن مجید کو نظام تعلیم کی اساس بنایا تھا اسی طرح عربی زبان کو اپنے نظام تعلیم کی علمی زبان کے طور پر باقی رکھا، یہی وجہ ہے کہ عہد وسطی میں صدیوں تک عربی زبان ساری متمدن دنیا میں علم وثقافت اور ترقی پسند فکر وخیال کے اظہار کا واحد ذریعہ رہی ہے۔

مسلمانوں نے قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر جو نظام تعلیم قائم کیا تھا اس کے فارغین طلبہ اور اس نظام کے پروردہ حضرات نے کیا علمی وتحقیقی خدمات انجام دیں اور دنیا کو کیا کیا علوم وفنون عطاء کئے، ان کا احاطہ اس جیسے سیکڑوں مضامین میں بھی ناممکن ہے۔

عہد وسطی کے مسلمانوں کی مختلف علوم وفنون میں علمی وتحقیقی خدمات کی تفصیلی معلومات کے لئے ابن ندیم کی ''الفہرست'' حاجی خلیفہ چلپی کی ''کشف الظنون'' کارل بروکلمان کی ''تاریخ الادب العربی'' اور فواد سیزگین کی ''تاریخ التراث الاسلامی'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت

ہندوستان میں عمومی طور پر جو نظام ونصاب تعلیم رائج تھا، اسے درس نظامی کہاں جاتا تھا، اور اُس وقت کے لحاظ سے وہ نہایت اپ ٹو ڈیٹ نصاب تھا، اس میں تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ منطق، فلسفہ اور دیگر علوم بھی شامل تھے۔ وہاں کے فارغین طلبہ میں اتنی استعداد پیدا ہوجاتی تھی کہ زندگی کے مختلف شعبہ میں اپنی خدمات انجام دے سکیں۔ چنانچہ مولانا قاسم نانوتوی، مولانا یعقوب نانوتوی اور ان کے والد مولانا مملوک علی جو دہلی کالج میں عربی کے پروفیسر تھے، سب اسی نظام ونصاب کے پڑھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے لوگ تھے جو اس نصاب کے پڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں بہترین خدمات انجام دیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

حکومت مسلّطہ سے قبل مسلمانان ہند میں تعلیم کا جو نظام قائم تھا، عام طور پر ''درس نظامیہ'' کے نام سے جسے شہرت حاصل ہوگئی ہے اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کہ وہ مسلمانوں کے صرف دینی تعلیم کا نصاب تھا۔ میں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم، نثر اور انشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب اور خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ (۱۷)

ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام ونصاب کی تفصیلی معلومات کے لئے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی ضخیم کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' کا مطالعہ کافی ہوگا۔

موجودہ نظام تعلیم: ذمہ داری اور تقاضے

مذکورہ بالا مباحث میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام ونصاب کا ایک سرسری جائزہ لینے سے ہم نے اندازہ کیا کہ گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے تعلیم کا جو نظام ترتیب دیا تھا اور جن خطوط پر اسے استوار کیا تھا وہ انتہائی جامع، مفید اور مؤثر تھا جس کے ذریعہ سے ایک طرف انہوں نے نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت، ان کی دینی واخلاقی تربیت کی، تو دوسری طرف اس نظام تعلیم کے ذریعہ ساری دنیا کو اپنے زیر نگیں کیا اور وہ ساری دنیا کے معلم قرار پائے۔

مسلمانوں کے نظام تعلیم کی خوبی یہ ہے کہ مسلمانوں نے علم کو خالق کے اسم سے جوڑا، قرآن و حدیث کو بنیاد بنا کر دیگر علوم کو پروان چڑھایا اور صرف مفید ومحمود کاموں تک علم کو محدود رکھا۔ جبکہ موجودہ

نظام تعلیم کی خرابی یہ ہے کہ اس نے خالق کے نام سے علم کو کاٹ دیا اور علم کے محمود و غیر محمود کی تمیز کو مٹا کر اس کو جہالت کے راستے پر ڈال دیا۔ آج تعلیم یافتہ طبقہ میں جو خرابیاں اور اخلاقی و فکری انحراف پایا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کا مقصد غلط سمجھا گیا۔ تعلیمی و تربیتی کردار کی غلط تشریح کی گئی اور سب سے بنیادی سبب تعلیم کا ملحدانہ اور مادی فلسفہ ہے۔ موجودہ نظام تعلیم انسانیت کے لئے مضر اور ہلاکت خیز ہے، جبکہ اسلامی نظام تعلیم ساری انسانیت کے لئے نفع بخش، امن عالم کے قیام میں مدد و معاون اور دینی و دنیوی ترقی و خوشحالی کا ضامن ہے۔

لہذا ہمیں بھی اپنے نظام و نصاب تعلیم کا از سر نو جائزہ لینا ہوگا اور ایسی حکمت عملی متعین کرنی ہوگی کہ ہمارے نصاب میں دین کی اصل روح کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں اور ضروریات زمانہ کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہو، اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ہماری محنت نتیجہ خیز ثابت ہو جائے تو یقیناً اس کے اثرات نہایت دوررس و دیرپا ہوں گے۔ تعجب نہیں کہ اس کام کو انجام دینے والا اس زمانہ کا مجدد قرار پائے۔ اس لئے کہ یہ اس روایت کا احیاء کرنے کے مترادف ہے جو اصل اسلامی روایت ہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنا ہے، اس کام کی ابتداء کہاں سے کی جائے، اس سلسلہ میں کن بنیادوں کا لحاظ رکھا جائے، یہ تمام باتیں غیر معمولی غور و خوض، مسلسل جدوجہد اور انتہائی صبر و ضبط کی متقاضی ہیں۔

یہ کام جتنا اہم اور ضروری ہے، اُتنا ہی کٹھن، دشوار اور صبر آزما ہے اور شاید اس کام کی مشکلات کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ''جوئے شیر لانے'' اور ''لوہے کے چنے چبانے'' جیسی مثالیں بھی ہلکی پڑ جائیں۔

اللہ رب العزت تمام مسلمانوں کو اس کام کی افادیت و قدر و قیمت سے آگاہ کریں، اپنی مدد و نصرت سے نوازیں اور عافیت و استقامت کے ساتھ اس کار خیر کو انجام دینے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین یارب العلمین!

نوٹ:۔ زیر بحث موضوع کا مکمل احاطہ اس مختصر مضمون میں جس میں خامیاں بھی ہیں انتہائی مشکل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قائم کردہ تعلیمی نظام و نصاب اور مسلمانوں کے عہد کی تعلیمی سرگرمیوں کا بالاستیعاب جائزہ اور اس کی روشنی میں ہمارے موجودہ تعلیمی نظام کی تشکیل و تعمیر مستقل تصنیف کی متقاضی ہے۔)

حواشی

۱۔ دعوت فکر وعمل ص ۱۰۹۔

۲۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (آرٹیکل ایجوکیشن)۔

۳۔ مغرب کا فکری وتہذیبی چیلنج اور علماء کی ذمہ داریاں، خطاب از ڈاکٹر محمود احمد غازی۔

۴۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت۔

۵۔ عہد نبوی میں نظام تعلیم ص ۵۳۔

۶۔ ایضاص ۵۴۔

۷۔ عہد نبوی میں نظام تعلیم از ڈاکٹر حمید اللہ۔

۸۔ ترمذی۔ابواب البر والصلۃ۔

۹۔ جمع الجوامع، عنوان تعلموا۔

۱۰۔ سنن ابوداؤد، کتاب العلم۔

۱۱۔ صحیح بخاری۔

۱۲۔ تاریخ ابن عساکر، ج ۵، ص ۴۴۷۔

۱۳۔ مستدرک حاکم، بحوالہ عہد نبوی میں نظام تعلیم، ص ۵۱۔ ۷۳۔

۱۴۔ مغرب کا فکری وتہذیبی چیلنج اور علماء کی ذمہ داریاں۔

۱۵۔ سورہ جاثیہ۔ ۱۳۔

۱۶۔ (New Researches Into Composition & Exegesis of the Qur'an, London, p.9) (بحوالہ اسلام اور علم ص ۲۳)

۱۷۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، حصہ دوم، ص ۶۔

☆ ☆ ☆

مولانا محمد قمر الزماں ندوی ۞

گھر کا سربراہ کون؟ مرد یا عورت

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہر اجتماعی نظام کے لئے عقلا اور عرفا یہ ضروری ہے کہ اس کا کوئی سربراہ حاکم یا امیر ہو کہ اختلاف ونزاع اور باہمی کشمکش کے وقت اسکے فیصلے سے کام چل سکے، جس طرح ملک وسلطنت اور ریاست وحکومت میں یہ سب کے نزدیک مسلم ہے، اور جس طرح قبائلی نظام میں بھی اس کی ضرورت وافادیت ہمیشہ محسوس کی گئی اور کسی ایک شخص کو قبیلہ کا حاکم وسردار مانا گیا ہے، اسی طرح عائلی نظام میں جس کو عرف میں خانہ داری کہا جاتا ہے اس میں بھی ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے، عورتوں اور بچوں کے مقابلے میں اس کام کے لئے حق سبحانہ وتعالی نے مردوں کو منتخب فرمایا ہے کہ ان کی علمی اور عملی قوتیں اور صلاحیت بہ نسبت عورتوں اور بچوں کے زیادہ ہیں، اور یہ ایسا معاملہ ہے کہ کوئی حقیقت پسند اس کا انکار نہیں کرسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک موقع پر بطور خاص مرد اور عورت کے درجہ کی تعیین کرتے ہوئے فرمایا گیا۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء آیت ۶۴) مرد عورت کے نگراں اور حاکم ہیں اس لئے کہ اللہ تعالی نے ایک صنف (قوی) کو دوسری صنف (ضعیف) پر بڑائی دی ہے کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں مرد کو عورت پر قوام بنایا گیا ہے۔ عربی زبان میں قوام اسے کہتے ہیں جو کسی کی حمایت، حفاظت اور کفالت کا ذمہ دار بن کر کھڑا ہو، اور جو شخص ان امور کی ذمہ داری لے گا، تسلط اور حکومت اس کے لیے ضروری اور لازم ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لفظ ''قوام'' کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''عربی میں "قام" کے بعد" علی '' آتا ہے تو اس کے اندر نگرانی، محافظت، کفالت اور تولیت کا مضمون پیدا ہوجاتا ہے " قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ "میں بالاتری کا مفہوم بھی ہے اور کفالت وتولیت کا بھی اور یہ دونوں باتیں کچھ لازم وملزوم سی ہیں۔ گھر کی

۞ استاد، مدرسہ نورالاسلام کنڈہ پرتاپگڑھ، جنرل سیکریٹری مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ

چھوٹی سی وحدت بھی جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ایک چھوٹی سی ریاست ہے، جس طرح ہر ریاست اپنے قیام و بقا کیلئے ایک سربراہ کی محتاج ہوتی ہے، اسی طرح یہ ریاست بھی ایک سربراہ کی محتاج ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ریاست میں سربراہی کا مقام مرد کو حاصل ہو یا عورت کو؟

قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مقام مرد کو حاصل ہے اور اس کے حق میں دو دلیلیں دی ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالی نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے، مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے جنکی بنا پر وہی سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اسی پر ڈالی جائے۔ مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت وصلاحیت یا کمانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد و ہمت اس کے اندر ہے وہ عورت کے اندر نہیں ہے، یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث کلی فضیلت نہیں ہے بلکہ وہ فضیلت ہے جو مرد کی قوامیت کے استحقاق کو ثابت کرتی ہے۔ بعض دوسرے پہلو عورت کی فضیلت کے بھی ہیں لیکن ان کو قوامیت سے تعلق نہیں ہے۔ مثلاً عورت گھر سنبھالنے اور بچوں کی پرورش ونگہداشت کی جو صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ مرد نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بات ابہام کے انداز میں فرمائی ہے جس سے مرد اور عورت دونوں کا کسی نہ کسی پہلو سے صاحب فضیلت ہونا نکلتا ہے۔ لیکن قوامیت کے پہلو سے مرد ہی کی فضیلت کا پہلو راجح ہے۔ دوسری یہ کہ مرد نے عورت پر اپنا مال خرچ کیا۔ بعض بیوی بچوں کی معاشی اور کفالتی ذمہ داری تمام اپنے سر اٹھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ذمہ داری مرد نے اتفاقیہ یا تبرعاً نہیں اٹھائی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اسی کے اٹھانے کی ہے۔ وہی اس کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہی اس کے حق ادا کرسکتا ہے'' (۱)

مذکورہ آیت کے ضمن میں صاحب تفہیم القرآن رقم طراز ہیں:

''قوام یا قیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اسکی حفاظت ونگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے، جیسا کہ ایک عام اردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لیگا، بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوام ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور عورت فطرۃ ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت وخبر گیری کے

تحت رہنا چاہیے''۔(۲)

مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے مالہ وماعلیہ کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

'' خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت میں وللرجال علیھن درجۃ (۲:۲۲۸) فرما کر اور سورہ نساء کی آیت متذکرہ میں ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ '' فرما کر یہ بتلا دیا گیا کہ اگر چہ عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم وواجب ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں اور دونوں کے حقوق باہم مماثل ہیں، لیکن ایک چیز میں مردوں کو امتیاز حاصل ہے کہ وہ حاکم ہیں۔ اور قرآن کریم کی دوسری آیات میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ حکومت جو مردوں کی عورتوں پر ہے محض آمریت اور استبداد کی حکومت نہیں، بلکہ حاکم یعنی مرد بھی قانون شرع اور مشورہ کا پابند ہے، محض اپنی طبیعت کے تقاضہ سے کوئی کام نہیں کر سکتا، اس کو حکم دیا گیا کہ عاشروھن بالمعروف (۴:۱۹) یعنی عورتوں کے ساتھ معروف طریقہ پر اچھا سلوک کرو۔ اسی طرح دوسری آیت میں عن تراضٍ منھما و تشاوُرٍ (۲:۲۳۳) کی تعلیم ہے، جس میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ امور خانہ داری میں بیوی کے مشورہ سے کام کریں، اس تفصیل کے بعد مرد کی حاکمیت عورت کے لئے کسی رنج کا سبب نہیں ہوسکتی، چونکہ یہ احتمال تھا کہ مردوں کی اس فضیلت اور اپنی محکومیت سے عورتوں پر کوئی ناخوش گوار اثر ہو، اس لیے حق تعالی نے اس جگہ صرف حکم بتلانے اور جاری کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ خود ہی اس کی حکمت اور وجہ بھی بتلا دی، ایک وہبی جس میں کسی کے عمل کا دخل نہیں، دوسرے کسبی جو عمل کا اثر ہے۔ پہلی وجہ یہ ارشاد فرمائی ''بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ '' یعنی اللہ تعالی نے دنیا میں خاص حکمت ومصلحت کے تحت ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے، کسی کو افضل کسی کو مفضول بنایا ہے، جیسے ایک خاص گھر کو اللہ تعالیٰ نے اپنا بیت اللہ اور قبلہ قرار دیدیا، بیت المقدس کو خاص فضیلت دیدی، اسی طرح مردوں کی حاکمیت بھی ایک خدا داد فضیلت ہے، جس میں مردوں کی سعی وعمل یا عورتوں کی کوتاہی و بے عملی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ دوسری وجہ کسبی اور اختیاری ہے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، مہر ادا کرتے ہیں، اور ان کی تمام ضروریات کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ ان دو وجہ سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا''۔(۳)

آگے ایک خاص نکتہ اور حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ لکھتے ہیں:

'' پہلی وجہ کے بیان میں مختصر طریقہ یہ تھا کہ رجال اور نساء کی طرف ضمیریں عائد

کرکے ''فضلھم علیھن'' فرما دیا جاتا، مگر قرآن کریم نے عنوان بدل کر ''بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ'' کے الفاظ اختیار کئے، اس میں یہ حکمت ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا بعض اور جز قرار دے کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگر کسی چیز میں مردوں کی فوقیت اور افضلیت ثابت بھی ہو جائے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے انسان کا سر اس کے ہاتھ سے افضل یا انسان کا دل اس کے معدہ سے افضل ہے، تو جس طرح سر کا ہاتھ سے افضل ہونا ہاتھ کے مقام اور اہمیت کو کم نہیں کرتا، اسی طرح مرد کا حاکم ہونا عورت کے درجہ کو نہیں گھٹاتا، کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مثل اعضاء واجزاء کے ہیں مرد سر ہے تو عورت بدن۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس عنوان سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ افضلیت جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے یہ جنس اور مجموعہ کے اعتبار سے ہے، جہاں تک افراد کا تعلق ہے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی عورت کمالات علمی وعملی میں کسی مرد سے بڑھ جائے اور صفت حاکمیت میں بھی مرد سے فائق ہو جائے۔

دوسری وجہ اختیاری جو بیان کی گئی ہے کہ مرد اپنے مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، اس میں بھی چند اہم امور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک تو اس شبہ کا ازالہ ہے جو آیات میراث میں مردوں کا حصہ دوہرا اور عوتوں کا اکہرا ہونے سے پیدا ہو گیا ہے، کیونکہ اس آیت نے اس کی بھی ایک وجہ بتلا دی کہ مالی ذمہ داریاں تمام تر مردوں پر ہیں، عورتوں کا حال تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے ان کے تمام مصارف کی ذمہ داری باپ پر ہے اور شادی کے بعد شوہر پر، اس لئے اگر غور کیا جائے تو مرد کو دوہرا حصہ دینا اس کو کچھ زیادہ دینا نہیں ہے، وہ پھر لوٹ کر عورتوں ہی کو پہنچ جاتا ہے۔ دوسرا اشارہ ایک اہم اصول زندگی کے متعلق یہ بھی ہے کہ عورت اپنی خلقت اور فطرت کے اعتبار سے نہ اس کی متحمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے، نہ اسکے حالات اس کے لئے سازگار ہیں کہ وہ محنت، مزدوری اور دوسرے ذرائع کسب میں مردوں کی طرح دفتروں اور بازاروں میں پھرا کرے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس کی پوری ذمہ داری مردوں پر ڈال دی، شادی سے پہلے باپ اس کا متکفل ہے اور شادی کے بعد شوہر۔ اس کے بالمقابل نسل بڑھانے کا ذریعہ عورت کو بنایا گیا ہے، بچوں کی اور امور خانہ داری کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈال دی گئی ہے، جبکہ مرد ان امور کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ عورت کو اپنے نفقات میں مرد کا محتاج کر کے اس کا رتبہ کم کر دیا گیا ہے، بلکہ تقسیم کار کے اصول پر ڈیوٹیاں تقسیم کر دی گئی ہیں، ہاں ڈیوٹیوں کے درمیان جو باہم تفاضل

ہوا کرتا ہے وہ یہاں بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں وجہوں کے ذریعہ یہ بتلا دیا گیا کہ مردوں کی حاکمیت سے نہ عورتوں کا کوئی درجہ کم ہوتا ہے اور نہ ان کی اس میں کوئی منفعت ہے، بلکہ اس کا فائدہ بھی عورتوں ہی کی طرف عائد ہوتا ہے'' (۴)

حافظ ابن کثیرؒ نے اس لفظ کی تشریح فرماتے ہوئے لکھا ہے۔ أی هو رئیسها و کبیرها والی کم علیها و مؤدبها إذا اعوجت۔ یعنی مرد عورت کا سردار ہے، بڑا ہے، اس پر حاکم ہے اور غلط روی کی صورت میں اس کو ادب سکھانے والا ہے۔ (۵)

الغرض شریعت اسلامی میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں یہ جو مقام ملا ہے اس کی اللہ تعالیٰ نے دو وجہیں بیان فرمائیں ایک وہبی، خداداد اور دوسری کسبی، اختیاری، وہبی اور فطری یہ کہ ''اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر بڑائی دی'' یعنی مرد کو جسمانی و عقلی قوتیں عورت سے زائد اور بہتر عطا فرمائیں جس کے نتیجہ میں مرد علمی و عملی کمالات میں عورت سے فائق ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ علمی و عملی کمالات ہی پر ترقی درجات کا انحصار ہے۔

مولانا زین العابدین سجاد میرٹھیؒ مرد اور عورت کے باہم تقسیم کار کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''گھر کے مختصر سے معاشرہ میں بھی مرد کو ریاست کا درجہ عطا فرمایا، کسب معاش کا بوجھ اسکے کاندھوں پر ڈالا اور خاندان کی صلاح وفلاح اور ان کی حفاظت وحمایت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی اور ملک وملت کی وسیع سوسائٹی میں بھی دشمنوں سے حفاظت، تدبیر امور مملکت اور عمومی نظم ونسق کی گراں بار ذمہ داریاں مردوں کے سپرد کیں چنانچہ جس طرح امامت کبریٰ (نبوت) (۱) اور امامت صغریٰ (نماز کی امامت) مردوں سے متعلق رہی ہیں اسی طرح خلافت امارت اور قضاء کے فرائض بھی مردوں ہی کے سپرد کئے گئے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں ولهذا كانت النبوة مختصةً بالرجال وكذلك الملك الأعظم بقوله صلى الله عليه وسلم لن يفلح قوم ولواأمرهم امرأة (رواه البخاری) وكذا منصب القضاء وغيرذلك۔ اور انہی وجوہ سے نبوت مردوں کے ساتھ مخصوص رہی ہے اور اسی طرح خلافت وامارت، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے امور مملکت عورتوں کے سپرد کر دیئے (بخاری) اور اسی طرح قضاء وغیرہ کے مناصب بھی مردوں سے متعلق رہے ہیں۔ (ابن کثیر) البتہ ملک وملت کے وہ مسائل جو عوتوں ہی سے متعلق ہیں ان میں عورتوں کی مدد کی جاسکتی ہے اور ضرورت پڑنے پر وقتی طور پر دوسری ذمہ داریاں بھی عورتوں کی صنفی

خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورتوں کے سپرد کی جاسکتی ہیں۔ اس فرق مراتب اور تقسیم فرائض سے عورتوں کی عزت وحرمت میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔(۶)

سورہ نساء کی مذکورہ آیت سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ عورت کی سربراہی از روئے شریعت درست نہیں ہے۔ اور عورت کی سربراہی کے خلاف قرآن کریم کی یہ نص، نصِّ قطعی کے درجہ میں ہے، جس کی تائید صحیح بخاری کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے'' وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہوگی جس نے اپنے امور ایک عورت کے سپرد کردیئے''(۷)

بعض حضرات حضرت عائشہؓ کی جنگ جمل میں شرکت اور ایک گروپ کی قیادت سے خواتین کے لئے سیاسی اور عسکری قیادت کا جواز ثابت کرتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی جنگ جمل میں شرکت قائد فوج کی حیثیت سے نہیں تھی اور نہ سپاہی کی حیثیت سے وہ شریک ہوئی تھیں، حضرت عائشہؓ کا مقصد محض قتل عثمان کے قصاص کا مطالبہ تھا، اس کے علاوہ اکثر صحابہؓ اور دوسری ازواج مطہرات کو حضرت عائشہ کے اس اقدام سے اتفاق نہیں تھا، اور خود ام المومنین حضرت عائشہؓ کو بھی اپنی اس اجتہادی غلطی کا احساس ہوگیا تھا اور اس مہم میں شرکت پر آپ کو پچھتاوا تھا، اس لئے حضرت عائشہؓ کے اس عمل سے عورت کے لئے حکومت و سیاسی کا جواز فراہم کرنا محض حقیقت کو منھ چڑھانا ہے، جب مذہب اسلام نے عائلی نظام کے لئے مرد کو سربراہ کی حیثیت سے منتخب کیا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ یہ مذہب خواتین کو گھر سے بے گھر کرکے حکومت ومملکت کا بارگراں صنف نازک کے کندھے پر ڈالدے اور وضع الشی علی غیر محلہ کا مصداق قرار پائے۔

مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ خدائے وحدہ لاشریک نے انسانوں کے درمیان صلاحیتوں کو تقسیم کردیا ہے تاکہ دنیا کا نظام مستحکم ومنظم انداز میں چلتا رہے اور اسی تقسیم کی طرف قرآن حکیم میں یوں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ (سورۃ النساء ۳۲) اور جو کچھ اللہ تعالی نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو، جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے، ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے''(۸)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔ ''قرآن نے اس آیت میں یہی بتایا ہے کہ مقابلہ کا میدان پیدائشی صفات یا فطری ترجیحات کا نہیں بلکہ اکتسابی صفات کا میدان ہے، یہ میدان نیکی، تقوی، عبادت، ریاضت، توبہ اور جامع الفاظ میں ایمان اور عمل صالح کا میدان ہے، اس میں بڑھنے کے لئے کسی پر روک نہیں، مرد بڑھے گا وہ اپنی جدوجہد کا ثمرہ پائے گا، عورت بڑھے گی وہ اپنی سعی کا پھل پائے گی، آزاد، غلام، باندی، شریف، کمینہ، بینا، نابینا سب کے لئے میدان یکساں کھلا ہوا ہے، خدا نے طبعی طور پر فضیلتیں بانٹی ہیں، ان سے ہزار درجے زیادہ اس کا فضل یہاں ہے، جو فضیلت کے طالب ہیں وہ اس میدان میں اتریں اور خدا کے فضل کے طالب بنیں'' (۹)

حواشی وحوالہ جات:

(۱) تدبر قرآن صفحہ ۲۹۱-۲۹۲ جلد دوم امین احسن اصلاحیؒ

(۲) تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۴۹ مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ

(۳) معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۳۹۶-۳۹۷ مولانا مفتی شفیع صاحبؒ

(۴) معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۳۹۷-۳۹۸ مولانا مفتی شفیع صاحبؒ

(۵) ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۴۱۱ بحوالہ قاموس القرآن صفحہ ۴۲۸ زین العابدین میرٹھی

(۶) قاموس القرآن صفحہ ۴۲۹ مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی

(۷) بخاری کتاب المغازی والفتن

(۸) سورہ نساء آیت ۳۲

(۹) تدبر قرآن جلد دوم صفحہ ۶۲

☆☆☆